ایک بات

عصمت چغتائی

مکتبہ اردو۔ لاہور

ایک بات

عصمت چغتائی

مکتبہ اردو، پوسٹ بکس ۹۵۳ — لاہور

ایک بات

ناشر ... چوہدری محمد اکبر
بار ... سوئم
تعداد ... ایک ہزار
سرورق ... سلیمان نور
کتابت ... انور کمال
قیمت ... ۱ روپے
مطبع ..... اردو ڈائجسٹ پرنٹرز لاہور

مکتبہ اردو، پوسٹ بکس ۹۵۳ - لاہور

رجسٹرڈ — قائم شدہ ۱۹۳۵ء

بانی

مکتبۂ اُردو

چوہدری برکت علی (مرحوم)

ترتیب

ایک بات

کہتے ہیں ایک آدمی تھا۔ اس کے تھیں چار بیویاں اور کمبختیں سب کی سب توتلی۔ ایک دن چند دوستوں کی دعوت کی۔ میاں سے سختی سے بولنے کو منع کر دیا کہ سنیں گے تو ہنسی اڑائیں گے۔ پر جب انہوں نے کھانے کی تعریف کی تو بیویوں کا جی نہ مانا اور بول ہی اٹھیں۔ تین تو خیر اپنی اپنی تعریف میں بولیں، پر چوتھی بیوی نے کہا: "بھلا ہوا جو ہم نہ برلے۔ میاں آئیں گے تو جوتے لگیں گے"۔

تو صاحب وہ جوتے لگے۔ مگر سب سے زیادہ ان آخری بولنے والی کے۔

تو آج کل ساقی سب کی باتیں سن رہا ہے تو ہم کیوں چپ رہیں۔ آخر ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں۔ آج کل باتوں کا عام موضوع "نیا ادب" ہے، ہمدرد لوگ انسانیت، اخلاق، ادب اور تہذیب کو گمراہی سے بچانے کے لئے اس شتر بے مہار یعنی نئے ادب کے پیچھے ہر قسم کے ہتھیار لے کر حملہ آور ہوئے ہیں اور قبلہ اونٹ صاحب کچھ بوکھلائے سے نظر آتے ہیں۔ اللہ جانے کس کروٹ بیٹھتے ہیں یا اور بدحواس ہونے کا ارادہ ہے۔

سنا ہے جب اونٹ کو غصہ آتا ہے تو دشمن کی کھوپڑی اتار لیتا ہے۔ کیا معلوم بھئی!۔

اور ذرا ہتھیار ملاحظہ ہوں اور بدکانے والے!

"نیا ادب فحش نگاری ہے"۔

"نیا ادب سوائے جنسی الجھنوں کے کچھ نہیں!!"۔

"نیا ادب گر رہا ہے" !!!۔

یا اللہ یہ فحش نگاری کیا ہوتی ہے۔ ہماری ایک خالہ تھیں جو کمسن لڑکیوں کو ہر وقت ڈھنگ سے دوپٹہ اوڑھنے کی تلقین کیا کرتی تھیں۔ ذرا شانہ سے دوپٹہ ڈھلکا اور ان کی آنکھوں میں خون اترا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اس خاص حصۂ جسم سے کیوں جلتی تھیں۔ معلوم ہوا کہ محترمہ چونکہ نہایت مرجھائی ہوئی گھٹائی کی شکل کی تھیں۔ لڑکیوں کے جسم کو دیکھ کر کوئلہ ہو جاتی تھیں۔ بچاری خالہ! نہ جانے کتنی خالائیں اور نانیاں جوانی کھو کر لڑکیوں کی سوتیں بن جاتی ہیں۔

یہی حال نئے ادب نے پرانے ادب کا کر دیا ہے اور وہ اس کے شباب کی تپش سے پگھلا جا رہا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا آخر اگر عریانی نظر آتی ہے تو لوگ بلبلا کیوں اٹھتے ہیں۔ یہ مانا کہ یوروپ کے لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم و تربیت بچپنے ہی سے کچھ اس انداز سے ہوتی ہے کہ ان کے نزدیک صنفی چیزوں کی کچھ اہمیت ہی نہیں رہ جاتی۔ وہ جب اس کے متعلق کچھ پڑھتے ہیں تو ان کے کانوں پر جوں بھی نہیں رینگتی اور یہاں سانپ پھنپھنانے لگتا ہے۔ کیوں صاحب کیا ضروری ہے کہ اس مقدس سانپ کو ہم اپنی آئندہ نسل کا خون چوسنے کے لئے زندہ چھوڑ دیں کیوں نہ اس کا پھن جلد از جلد

کچل کر قصہ پاک کر دیا جائے اور نئے ادیب جو چن چن کر سانپوں کو کچلنے کی فکر میں ہیں۔ دشمنِ دین و دنیا کیوں سمجھے جا رہے ہیں۔

مگر یہ بھی تو غلط ہے کہ نئے ادب میں صرف عریانی ہی ہے۔ وہ مثل ہے نا کہ جیسی روح ویسے فرشتے، چند اصحاب نے صرف عریانی کو پڑھا اور وہ ان کے دل و دماغ پر نقش کر گئی۔ باقی مطلب کی باتیں معلوم ہی نہ ہوئیں۔ لہٰذا نظر انداز کر دیں۔ مگر یقیناً عریاں جملے سو سو بار رٹے۔ ذرا غور کیجئے عریانی پڑھنے کے شوقین تو معصوم بن کر چھوٹ جائیں اور لکھنے والا ابرا۔

یہ ضروری نہیں کہ ہر گندگی فضول کو بھی دکھائی جائے اور بے کار سڑکوں پر ننگے گھومنے لگیں۔ لیکن اگر غسل آفتاب کے لئے کسی ضروری حصہ جسم کو کھولنے کا موقع آئے تو اس میں کیا شرم۔

اگر پٹی کھولنے سے زخم خشک ہو جائے تو یہ عریانی نہیں ہوتی بلکہ اسے علاج کہتے ہیں اور وہ بزرگ جو اس سے چڑ جائیں قابلِ رحم ہیں یہ تو ٹھیک ہے کہ عریانی تکلیف دہ ہوتی ہے اور اس عریانی ادب کے آئینے میں نہ جانے کیا لوگوں کو جھلک نظر آتی ہے کہ وہ اینٹ لے کر غریب آئینے پر دانت پیس کر دوڑتے ہیں، بھلا سوچئے تو اس میں آئینہ کا قصور ہی کیا؟

شاید افسانوں اور کہانیوں میں عریانی دیکھ کر لوگوں کے رکیک جذبات میں ہیجان پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک صاحب کو زہرہ کا مرمریں مجسمہ دیکھ کر مرگی کا دورہ پڑ جاتا ہے۔ اب اس کا علاج کسی ادیب کے پاس تو نہیں۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ واقعہ کو واقعہ سمجھ کر پڑھئے، ارے صاحب یہ تو زندگی کی تصویر ہے کھلی بھی ہے۔ ڈھکی

بھی ہے۔ اگر عریانی ہے بھی تو کیا ضرور کہ مرگی کا دورہ ضرور ڈالا جائے۔ ضبط اور جذبات پر قابو بھی تو کوئی چیز ہے اور ایسا عریانی میں عیب ہی کیا ہے جو آپ ادب کی عریانی سے لرزے جاتے ہیں۔ یہ نہیں دیکھتے کہ ادیب خود دنیا کی عریانی سے لرز اٹھا ہے اور دہشت کے مارے کانپ رہا ہے۔ وہ تو صرف حروف میں اپنی باتوں کو منتقل کر رہا ہے جو دنیا میں ہو رہی ہیں۔ نیا ادب موجودہ زمانہ کی تاریخ ہے۔ برسوں بعد بھی جب یہ نیا ادب پرانا ہو گا تب بھی اسی طرح سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی حالات کے متعلق تاریخی مواد پہنچاتا رہے گا۔ یہی کہانیاں اور نظمیں تاریخ کے صفحات میں تبدیل ہو جائیں گی۔ اگر نیا ادب گندہ ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ نئی دنیا گندی ہے۔ جس کی یہ تصویر ہے مصور کا کیا قصور؟۔

تاریخ اور ادب ساتھ رہے ہیں اور رہیں گے۔ اقتصادیات کو بھی ادب سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ خواہ سیاسی مجبوریاں ادب کو سیاست سے دور رکھیں پھر بھی دبا چھپا رنگ پھوٹ ہی نکلے گا۔ اس نئے ادب سے پہلے رومان اور مزاح کا زور تھا۔ پطرس، عظیم بیگ، رشید احمد، شوکت تھانوی، امتیاز علی تاج، فرحت اللہ بیگ سب ہی تو کم و بیش ایک ہی سا لکھتے ہیں۔ ذرا غور سے پڑھیے۔ وہی بیوی کے مظالم، دوستوں کی خوش مذاقیاں گھریلو جھگڑے سب کے سب ایک ہی بات بار بار لکھتے تھے۔ ہاں یہ بات اور بھی کہ سب کا رنگ جدا تھا اور اب نئے کیا لکھ رہے ہیں جنسی الجھنیں، امیر و غریب کے جھگڑے، زندگی سے جنگ اور جملہ دنیا کی تلخیاں! یہ تو ہمیشہ ہوتا ہے۔

پھر نئے ادیبوں سے کیوں شکایت ہے کہ وہ سب ایک رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ کس قدر فضول نقص ہے۔ ارے صاحب ملیریا پھیلتا ہے تو سب کو کونین ہی دیتے ہیں۔ دکھ درد میں سب انسان ایک ہی طرح روتے پیٹتے ہیں۔ کوئی گانا تو ہو نہیں رہا جو سُر تال میں ہو پرانا ادب بھی زندگی کی تصویر تھی اور نیا ادب بھی۔ یہ مانا کہ جب پرانا ادب لکھا گیا تو یہ دنیا اتنی گندی اور عریاں نہیں تھی اور اب آپ جدھر نظر اٹھا کر دیکھئے دنیا ننگی، بھوکی، چور، اچکی اور مکار نظر آتی ہے۔ نئے ادیب کیا کریں۔ کیسے آنکھوں پر پٹی باندھ کر گل بکاؤلی اور مثنوی گلزارِ نسیم لکھنے لگیں۔ فسانۂ آزاد اور بذلہ آمیز کہانیاں لکھتے چلے جائیں۔ نئے ادیب زیادہ ترنگے بھوکے اور حساس ہیں۔ دل و دماغ زیادہ تیزی سے کام کر رہے ہیں اور ذرا سی چوٹ سے بھنّا اٹھتے ہیں۔ ان کے بھیانک خواب جن کی اور بھی بھیانک تعبیریں یہ ہماری دنیا کا نقشہ ہے۔ برا ہے یا اچھا۔ یہ فیصلہ آئندہ پود کے ہاتھ میں ہوگا کہ وہ اسے سینہ سے لگائے یا ٹھکرائے۔ ہم اور آپ کبھی انصاف سے کچھ نہیں کہہ سکتے اور آپ کا فیصلہ بیکار ہے کیونکہ وہ بے اثر ہوگا۔ نیا ادب جو کچھ بھی ہے وہ موجودہ نوجوان کی پکار ہے جو چوٹ کھایا ہوا سانپ ہے۔ وہ دب نہیں سکتا۔ آپ کے اعتراض اور طعنے اسے خاموش دبک جانے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ وہ چیخے گا۔۔۔ دکھ ہوگا تو روئے گا یہ جو جنسی بھوک ہے جس پر مہذب لوگوں کو اعتراض ہے۔ اسی طرح کہانیوں میں جھلکے جائے گی جب بھوک ہی بھڑ کی تو پھر ہائے ہائے کیوں نہ ہو۔ نئے ادیب اتنے شرمیلے اور بزدل نہیں جو طعنوں تشنوں سے ڈر جائیں گے۔ یہ جنسی پکار جو افسانوں میں نظر آ رہی ہے۔

کیا ان کا تعلق اقتصادی اور معاشرتی حالات سے کچھ بھی نہیں۔ کیا اس میں آپ کو سیاست کی چاشنی نظر نہیں آتی۔ آپ نے ڈیمانڈ اور سپلائی والا SUPPLY & (DEMAND) کے متعلق اکنومکس میں پڑھا ہوگا۔ ذرا اس نکتے کو ہماری موجودہ زندگی پر پرکھئے۔ جتنی ڈیمانڈ بھی ہے اور سپلائی بھی ... مگر مارکٹ نہیں، یعنی عورتیں بھی ہیں اور مرد بھی اور خواہشات بھی۔ مگر ان کا ذکر بے شرمی۔ ہندوستان کے لوگ غریب ہیں ... اکثر نادار ہیں۔ ناداری میں شادی مصیبت ناداری میں عیاشی گناہ ... ناداری میں جینا منع کیوں؟ آخر کیوں، ہمارے نوجوان باوجود تعلیم اور جسمانی قابلیت رکھنے کے دنیا کی دلچسپیوں سے محروم۔ علم تو الٹا ہمارے لئے مصیبت ہو گیا کہ نہ پڑھتے نہ یہ معلوم ہوتا کہ دنیا کے دوسرے انسان کیا مزے اڑا رہے ہیں۔ مزے سے اپنی چمڑی میں مگن رہتے مگر اب ہم جانتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اور ملکوں میں زندہ رہنا جرم نہیں اور یہاں کے نوجوانوں کو کچھ بھی نصیب نہیں۔ یہاں ہر بات عیب، ہر بات گندی، عریاں اور مخرب اخلاق، وہاں عیش کے ہزاروں اسباب، یہاں زندگی کے خواب دیکھنا جرم، خیر اگر یہ مصیبتیں تھیں تو کم از کم احساس ہی کند ہوتا۔ کاش مٹی کے تودے ہوتے جو نہ سنتے نہ دیکھتے نہ دکھ سکھ سے چلاتے۔ زمانہ کی ٹھوکروں میں لڑھکتے فنا کی طرف چلے جاتے مگر نئی دنیا کا نیا بیٹا ضدی، بدمزاج اور اکھڑ ہے۔ وہ موجودہ نظام کو پسند نہیں کرتا۔ وہ ایک نئے نظام کے لئے بیکل ہے۔ وہ اسے بدل ڈالنا چاہتا ہے۔ مگر ابھی تو وہ بدنظمی سے متنفر، غصہ ہو کر اپنی ہی بوٹیاں چبا رہا ہے۔ خود اپنا ہی جسم اور روح چیر کر پھینک رہا ہے اور کل وہ اس نظام کو توڑ پھوڑ کر

دوسرا نظام بنائے گا مگر اس نظام کو توڑنے سے پہلے اسے نہ جانے کس کس کو کچلنا پڑے گا۔ کس کس کے پیروں سے روندا جاتے گا.... اور جو باقی رہے گا وہی نئے نظام کی تکمیل کرے گا۔

یہ نظام کیا ہوگا؟ یہ ابھی کسی کو نہیں معلوم۔ نئے ادب کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نئے نظام میں دکھ، بھوک اور افلاس تو نہ ہوگا.... فاقے نہ ہوں گے اگر ہوں گے تو صرف انسانوں کے گھر ہوں گے جہاں انسان رہے گا۔ عورتوں کو بھوکی کتیوں کی طرح غلیظ موریوں میں عذاب دوزخ بن کر نہیں بیٹھنا پڑے گا۔ مرد حیوانیت سے دور ہوں گے۔ قدرت کے اصول کے مطابق جو انسان پیدا ہوں گے وہ انسان ملتے جائیں گے اور انہیں صرف سماج کا پیٹ بھرنے کے لئے حلال نہیں کیا جاتے گا۔ شادی بیاہ صرف پیسے ہی والوں کے نہ ہوں گے بلکہ ہر تندرست انسان کو مکمل زندگی گزارنے کا حق حاصل ہوگا۔

نیا ادب پکار پکار کر انسان کو جینے کا حق دلانا چاہتا ہے۔ زندگی اور اس کے سارے لوازمات جو باپ دادا کی وراثت بن گئے ہیں۔ انسان کا حق ہو جائیں گے۔ نئی دنیا کے دکھ بہت بڑھ گئے اور نیا ادب اسی دنیا کے دکھوں کی آہ ہے۔ جو دنیا کے ہر ذی روح نوجوان کے چور چور جسم سے نکل رہی ہے طعنے دینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ بڑھیاں طعنے دیتی مر گئیں.... بڑھے لاحول بھیجتے چل دئے مگر نوجوان زندگی کی کشمکش میں پھنسا ہوا ہے۔ وہ مٹنے کے لئے تیار نہیں وہ بزدل نہیں اور اسے بے شرمی کے خطاب سے ذرا بھی شرم نہیں آتی۔ جب ادب کا سوال آتا ہے تو اس میں زنانہ مردانے ادب کا کیا سوال۔ جو نظام لڑکوں

کو پسند نہیں وہ لڑکیوں کو کب پسند آسکتا ہے۔ مرد اگر چیخ سکتا ہے تو عورت کو بھی کراہنے کی اجازت ہونی چاہئے۔

نئے ادب کا مقابلہ ایک بزرگ جنسی کتابوں سے کرتے ہیں، بالکل ٹھیک لیکن معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ہمارے ملک کے لوگ جنسی معلومات پر لکھی ہوئی کتابوں کو صرف لذت کے لئے پڑھتے ہیں۔ اسی طرح وہ نئے ادب سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں۔ جنسی معلومات پر کتابیں طبی اصول واضح کرنے کو لکھی گئی تھیں لیکن لوگ ان سے ادبی ذوق فرمانے لگے اور اسی طرح نئے ادب کو ناول اور افسانہ سمجھ کر مزہ لینا چاہتے ہیں مگر بجائے اس میں چٹخارے دار مسالہ کے جیب کو مین نکلتی ہے تو غریب ادیب کے جنم ہیں تھوکتے ہیں۔

آخر میں ایک بات نئے ادیبوں سے! ان فضول طعنوں کی پروا نہ کیجئے۔ یہ اعتراض کب نہیں ہوئے؟ کس نے نہیں نہیں کئے؟ سوائے دادی اماں کے لاڈلے بیٹوں کے کون ایسا ہے جس نے کبھی بزرگوں سے شاباشی وصول کی ہو؟ نوجوانی سے بزرگوں کو ہمیشہ نفرت رہی ہے اور رہے گی۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ جو کچھ لکھتے ہیں یہ بزرگوں کے لئے ہے بھی نہیں۔ کچھ کہیں تو ادب سے سر جھکا کر مسکرا دیجئے لکھے ضرور لکھے۔ جو کچھ آپ دیکھتے ہیں، سنتے ہیں، سوچتے ہیں، وہ ضرور لکھیئے۔ نہ زبان کی غلطیوں سے ڈریئے نہ اس بات سے ڈریئے کہ کوئی آپ کو ادیب نہیں مانتا۔ اگر آپ جس دنیا میں رہتے ہیں۔ اس میں کچھ مسموم کانٹے ہیں۔ کچھ بھیانک درندے ہیں۔ کچھ خوفناک کیڑے مکوڑے ہیں تو آئندہ نسل کے لئے اسے لکھ جائیے۔ اس کا سبق آپ کے ہی تجربے ہوں گے۔ آپ کے ہی مشاہدے

ان کے ذہنی مشاہدات ہوں گے۔ اچھا بڑا کڑوا کسیلا سب کچھ لکھ دیجئے اور وہ خوراکیں جو ہمارے شریر مریض پینے سے انکار کر رہے ہیں اور بے طرح مچلے جاتے ہیں آئندہ نسلیں انہیں فخریہ احترام سے لیں گی۔ کیونکہ آئندہ نسل زیادہ سمجھدار روشن دماغ اور اچھے برے کو پرکھنے والی پیدا ہوگی۔ اس کے لئے یہ خوراکیں بھارنی ہوں گی۔ وہ نسل واقعہ کو واقعہ سمجھ کر پرکھے گی۔ اس کے جذبات اس قدر بودے نہ ہوں گے جو عریانی اور سچی بات سے پھڑ پھڑا جائیں جیسے شیر کی بو پاکر گھوڑا بدکنے لگتا ہے مکھئے اور اتنا لکھئے کہ یہ ان کے لئے بالکل معمولی بات ہو جائے اور ان جراثیم کو اپنے تیزاب جیسے ادبی مادے سے تباہ کر دیجئے اور یہی روئی کے گالے جن میں ایک چنگاری بھی پڑ جائے تو بھک سے اڑ جاتے ہیں۔ برف کے گالے بنا دیجئے جن میں انگارے بھی سرد پڑ جائیں۔

اور چلتے چلتے ایک بات ان بزرگان قوم سے کہ یہ نوجوانوں پر اعتراض تو اب پرانا فیشن ہو گیا... اور پرانی چیز کو دفن ہی کر دیا جائے تو بہتر ہے۔ بیشک آپکو برا لگتا ہے اور آئندہ ادیب ان موجودہ ادیبوں کو برا لگے گا۔ موت کسی کو اچھی نہیں لگتی۔

ان اصحاب کو کیونکر بھول جاؤں جو خود تو خوب لکھ چکے اور اب تائب ہو گئے ہیں نصیحت پر تل گئے ہیں۔ ایک صاحب تو بہت ہی بگڑ گئے اور انہوں نے چند لاجواب اشعار بھی گنہگاروں کو راہ راست پر لانے کے لئے لکھے جن کی داد دئے بغیر نہیں جاتا مجھے بدقسمتی سے ان کا قافیہ اور ردیف اس وقت یاد نہیں آرہا مگر جو دل پر معنی نقش ہیں وہ یہ ہیں کہ ادیب جو ایسی فحش نگاری کرتے ہیں تو کیا ان کی بہن ماں نہیں۔ علاوہ شاعری حسن کے یہ ایک بالکل نرالا اور شاعرانہ گالی دینے کا مہذب طریقہ ہے اور مجھے از حد خوشی ہوئی کہ باتوں میں پیچھے

سہی لیکن اس ہنر میں ہم ہر ملک سے بہت ترقی کر چکے ہیں۔ ان حضرات سے دست بستہ عرض ہے کہ قبلہ اگر ماں بہنیں نہ ہوتی تو پھر مشاہدہ کہاں ہوتا؟ یہ ادب ہے۔ گپ اور خرافات تو ہے نہیں کہ نشہ پی کر لکھ ڈالا۔ نیا ادب زندگی کی تصویر ہے اور اس کے لئے ماڈل درکار ہیں۔ پھر؟ آپ کہیں گے: "شرم نہیں آتی!" "جی سچ مچ کی تو نہیں آتی.... اگر آپ کہیں تو رعایتاً شرمانے کو تیار ہیں"۔

اگر مصور شرمانا ہی شروع کر دیتے تو آج آپ کو آرٹ نظر نہ آتا اور پھر نئے ادیب آئینہ ساز ہیں، ہر شخص اس آئینہ میں منہ دیکھ کر شرما سکتا ہے۔

اوہ.... ہاں بس ایک بات اور ان اچھے فرمانبردار بچوں سے جو اخلاق اور تہذیب کے حامی اور ادب سے اسے بچانا چاہتے ہیں۔ وہ ہرگز ہرگز نہ نیا ادب لکھیں اور نہ پڑھیں کیونکہ نیا ادب "اخلاق" اور "تہذیب" کی دھجیاں بکھیرتا ہے۔ یہ تو صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو بے خوف اور بے جگرے ہیں جن کا ہاتھ بھی سڑ جائے تو اسے کاٹ کر پھینک سکتے ہیں کجا جھوٹی اور بناوٹی سوسائٹی....

جو اس بات کی پروا نہیں کرتے کہ اخباروں نے بائیکاٹ کر دیا یا ادیب روٹھ گئے.... اور وہ دن دور نہیں جب اس کا ادب ریزہ ریزہ لوگ پلکوں سے چن لیں گے۔ مورخین اکنومسٹ اور محکمہ تعلیم والے اس کو جمع کر لیں گے۔ اگر یہ موجودہ ادب موجودہ زمانہ کی سچی تصویر ہے تو خود بخود عجائب خانہ کی زینت بن جائے گا اور اگر کوڑا کرکٹ ہے تو اپنے راستے لگ جائے گا........

ہمیں کیا فکر؟

ننھی سی جان

"تو آپا پھر اب کیا ہو گا"؟

"اللہ جانے کیا ہو گا۔ مجھے تو صبح سے ڈر لگ رہا ہے"۔ نزہت نے کنگھی میں سے الجھے ہوئے بال نکال کر انگلی پر لپیٹنا شروع کئے۔ ذہنی انتشار سے اس کے ہاتھ کمزور ہو کر لرز رہے تھے اور بالوں کا گچھا پھسل جاتا تھا۔

"ابا سنیں گے تو بس اندھیرا ہو جائے گا۔ خدا کرے انہیں نہ معلوم ہو مجھے ان کے غصہ سے تو ڈر ہی لگتا ہے"۔

"تم سمجھتی ہو، یہ بات چھپی رہے گی۔ امی کو تو کل ہی شبہ ہوا تھا کہ کچھ دال میں کالا ہے۔ مگر وہ سودے کے دام دینے میں لگ گئیں اور شاید پھر بھول گئیں۔ اور آج تو.....:

"ہاں آپا۔ چھپنے والی تو بات نہیں ہے تو یہ کہتی ہوں جب رسولن کے ابا کو خبر ہو گی۔ تب کیا ہو گا؟ خدا قسم بھوت ہے وہ تو..... مار ہی ڈالے گا اس کو..... ہمیشہ ایسا ہی مارتا ہے کہ......

"اور اس نے کسی کو بتایا بھی تو نہیں۔ کیسی پکی ہے! پچھلی دفعہ جب دین محمد کا

قصہ ہوا تو جب بھی چپکے سے خالہ کے ہاں بھاگ گئی... بھائی جان دونوں کو نکال لیتے کو کہتے تھے..." بال جماتے کے لئے وہ اوپر سے مہین دانے کی کنگھی پھیرنے لگی۔

" ہاں اور اس بچارے کی اتنی سی تو تنخواہ ہے۔ بھیا جان پولیس میں دینے کو کہتے ہیں اور دیکھ لیتا ایک وہ چھوڑنے والے نہیں۔ بہن حد ہو گئی۔ معلوم ہے ابّا جان کا غصّہ!"

"تو آپا وہ پولیس میں دے دیں گے؟" سلمہ کی آواز بے قابو ہو گئی" اور نہیں تو پھر کیا؟" -

" پھر، پھر کیا ہوگا...... بچاری رسولن...... آپا... پولیس کے نام سے تو میرا ابھی جی ڈرتا ہے"

" ڈرنے کی بات ہی ہے...... پولیس کسی کو نہیں چھوڑتی... وہ تمہیں یاد ہے ننھو کی بہو نے ہنسلی چرائی تھی تو دونوں گئے تھے جیل خانے"

" ہتھکڑیاں ڈال کر لے جاتے ہیں... کیوں آپا؟" .

" ہتھکڑیاں اور بیڑیاں"

" لوہے کی ہوتی ہیں نا"

" ہاں پکے فولادی لوہے کی"

" پھر کیسے اترتی ہوں گی مر جاتے ہوں گے۔ تب ہی اترتی ہو گی۔ کیا کرے گی بچاری رسولن"

" اور کیا بچاری...... بھئی مذاق تھوڑی ہے...... اور تم نے دیکھا اس

نے کاڑا کس صفائی سے بچارے کو ہمت تو دیکھو ہمیں بھی نہ بتایا اسے اس نے تو کسی کو بتایا ہی نہیں"

"کیسی بے رحم ہے۔ ہاے بچارا بچہ۔ اس کا جی بھی نہ دکھا۔ ننھی سی جان"

"کیا مشکل سے جان نکلی ہو گی"

"مشکل سے کیا نکلی ہو گی۔ ایک انگلی کے اشارے سے بچارا ختم ہو گیا ہو گا"

"چلو ذرا اس سے پوچھیں کیسے مارا اس نے"

دونوں ڈری سمٹی آنکھ بچاتی تلوؤں سے جوتیاں چپکائے گودام کی طرف چلیں۔ جہاں اناج کی گول کے پاس ٹاٹ پر رسولن پڑی ہوئی تھی پاس ہی دو تین ننھی ننھی چوہیاں گرا پڑا اناج اور مرچ کے دانے لینے ڈری ڈری گھوم رہی تھیں۔ دونوں کو دیکھ کر ایسے بھاگیں جیسے وہ مار ہی تو دیتیں۔ حالانکہ آنے والیوں کے دل چوہیوں سے بھی زیادہ بودے تھے۔ تھوڑی دیر تک وہ رسولن کے زرد چہرے اور پپڑائے ہوئے ہونٹوں کو دیکھتی رہیں۔ رسولن نوکرانی تھی پر وہ بچپن سے دوست ہی رہیں اور ویسے تھوڑی بہت رسولن ہی مزے میں تھی وہ پردہ نہیں کرتی تھی اور مزے سے دوپٹہ پھینک کر آم کے پیڑ تلے کودا کرتی یہ دونوں جب سے ان کے ماموں رام پور سے آئے تھے پردہ میں رہتی تھیں اور گلاب ساگر والی نانی نے آکر سب کو موٹی کلف دار ململ کی اوڑھنیاں بنا دی تھیں اور باہر قدم رکھنا جرم تھا۔ یہ رسولن ہی تھی۔ جو ان پر رحم کھا کر دو چار کویل

ماری امیاں انہیں بھی کھڑکی سے دیتی تھی۔ جہاں وہ پر کٹے طوطوں کی طرح ٹکر ٹکر دیکھا کرتی تھیں اور ماموں کی مونچھ کی نوک بھی دکھ جائے تو وہ غڑاپ سے پیچھے کود پڑتی تھیں اور اب یہ رسولن پر بتیا پڑی تھی۔

"رسولن — اے رسولن — کیسا ہے جی"؟

"جی! رسولن نے جیسے آہ کھینچ کر کہا" اچھی ہی ہوں نزہت بی"

"کیا بخار تیز ہے — اور درد اب بھی ہے یا گیا —"؟

"ہاں نزہت بی سلمہ بی —"

"ارے بھئی پھر کچھ کرنا۔ کہدے ماں سے کہ حکیم صاحب کے یہاں سے لادے کوئی دوا —"

"نہیں بی بی — مار ڈالے گی ماں تو — ویسے ہی غصہ رہتی ہے — اور اب تو اور بھی"

"ہا! غریب لڑکی! — مرتی ہو تو کوئی دوا لاکر نہ دے — حد ہے ظلم کی! اسلمہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

"مگر کب تک چھپائے گی — مٹی بھی تو ٹھیک سے نہیں ڈالی تو نے۔"

"کیا؟ تو کیا سب کو معلوم ہو گیا تھا!" رسولن اور بھی زرد پڑ گئی اس کے سرمئی گال مٹی کے رنگ کے ہو گئے۔

"اب بس ہم سے مت بنو۔ ہمیں سب معلوم ہے۔ ہمیں کیا سب کو ہی

معلوم ہے۔"

"ہیں؟ ــــ آپ کو ــ نزہت بی، آپ نے کہاں دیکھا" وہ لرز کر اٹھنے لگی۔

"اور کیا ہمیں کل ہی معلوم ہو گیا تھا اور ہم پچھواڑے جاکر دیکھ آئے ہیں۔ اور سلمہ گئے تھے ــــ"

"ہاں ــــ ہم نے دیکھ لیا ــــ" سلمہ جلدی سے بولی کہ کہیں وہ پیچھے نہ رہ جائے اور رسولن سمجھی سب کچھ بس آپا ہی دیکھ سکتی ہیں۔

"شی اتنی زور سے نہ بولو ــ" دونوں خود ہی ڈر کر سمٹنے لگیں۔

"ہم اور آپا کل گئے تھے شام کو۔ پھر ہم نے ڈھونڈا تو مہندی کے قریب ہمیں شبہ ہوا۔ پھر قمیض کا کونا دکھائی دیا ــ جس کے چیتھڑوں میں لپیٹا ہے تو نے۔"

"ہاں دین محمد کی پھٹی ہوئی قمیض ــــ اور میرے تو رونگٹے کھڑے ہو گئے ــــ بچارے کی گردن یوں ــــ ٹیڑھی ہو گئی تھی ــ" نزہت نے ذبح کی ہوئی مرغی کی طرح گردن اکڑائی۔

"پھر ــــ پھر سلمہ بی ــ پھر آپ نے کہدیا ہو گا سب سے ــــ ہائے میرے مالک! میری ماں! ــــ"

"ہم ایسے چھچھورے نہیں ہیں رسولن ــــ تیری شکایت کیسے کر دیتے ــــ اور پھر جبکہ ہمیں معلوم ہے کہ تو اکیلی ہی قصوروار نہیں ــــ یہ

دین محمد ـــ"

"اس بدذات کا میرے سامنے نام نہ لیجئے ـــ بیوی ـــ"

"ہم تو کتنی دفعہ کہہ چکے تجھے اس کتے سے نہ بولا کر، ہمیشہ تجھے ذلیل کراتا ہے ـــ مگر ـــ"

"اچھی بیوی اب مردوے سے بولوں تو رسولن نہیں، بھنگن کی جنی بس ـــ تو اب آپ کہدیں گی سب سے اور جو سرکار کو معلوم ہو گیا تو خیر نہیں ہائے میرے اللہ ـــ مَیں تو مر ہی جاؤں ـــ"

ایک تو اندھیرا اوپر سے نڈر چوہیاں پھر رسولن مرنے کی دھمکی دے نزہت کی انگلیوں کے پورے ٹھنڈے پڑ گئے اور سلمہ کی آنکھوں میں مرچیں مچنے لگیں۔

"کیسی باتیں کرتی ہے رسولن!" سلمہ کی ناک بھی جل اٹھی۔

"کیا کروں بیوی، جی کرتا ہے اپنا گلا گھونٹ لوں" اور وہ جی چھوڑ کر سسکیاں لینے لگی۔

"ہیں، ہیں رسولن! کیا باتیں منہ سے نکالتی ہو، خدا سب کا مددگار ہے۔ وہ ہی سب کی مصیبت دور کرتا ہے۔ مجھے تو نامراد دین محمد پر غصہ آرہا ہے۔ جیسے اس کا تو کچھ قصور نہیں ـــ" نزہت نے کہا۔

"ہاں بھئی لڑکوں کو کون کچھ کہتا ہے۔ دین محمد کچھ بھی کردے، بھائی جان حمایتی، اباجان طرفدار، اور بیچاری رسولن کی ماں بھی غریب کیا کرے سچ کہتی ہیں امی لڑکیاں جنم سے کھوٹا نصیبا لے کر آتی ہیں"

سلمہ کے گالوں پر سچ مچ آنسوؤں کی لکیریں بہنے لگیں۔ تینوں کے گلے بھر آئے اور نزہت کی ناک میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں، جانو کسی نے پانی چڑھا دیا ہو۔ تینوں چوہیاں بھی شاید بھول سے مرچ کا دانہ چبا گئیں آنسوں بھری غمگین آنکھوں سے، دور بیٹھی سسکیاں بھر رہی تھیں۔ ان کی بھوری مونچھیں شدتِ اضطراب میں بھٹے کی بالوں کی طرح کانپ رہی تھی۔

"میری نزہت بی بتائیے اب میں کیا کروں مجھے تو دادی بی کی پٹاری میں سے افیون لا دیجئے۔ سچ مچ کھا کر ہی سو رہوں۔" رسولن نچلا ہونٹ کاٹنے لگی۔

"نہیں رسولن خودکشی حرام ہے۔ اب تو بات معلوم ہوتی ہے۔ دب دبا گئی اور کسی کو پتہ نہ چلے گا۔ اور تو اچھی ہو جائے گی" — سلمہ بولی۔

"کیا کروں گی اچھی ہو کر اس رات دن کی جوتیوں سے تو موت اچھی!"

"مگر میں پوچھتی ہوں — یہ تو نے کیسے مارا — اے ہے ذرا سا ننھا —" نزہت کا آخر کو جی نہ مانا۔

"میں نے؟ بی بی آپ — ہو ہو — ہو — ہو —" رسولن بیمار کتیا کی طرح رونے لگی۔

"چپ رہو آپا تم اور غریب کا دل دکھا رہی ہو۔ ہچ ہچ مت رو رسولن۔" سلمہ آگے کھسک آئی۔

"چلو امی آ رہی ہیں —" نزہت اور سلمہ دروازے کے پیچھے دبک گئیں امی لوٹا لیے نکلی چلی گئیں۔

"ٹھہرو بیوی کہو گی تو کسی سے ـــ" رسولن نے گڑگڑا کر سلمہ کے پائینچے کی گوٹ پکڑ لی۔

"نہیں ـــ ارے چھوڑ ـــ ارے ـــ" دونوں سکتہ میں رہ گئیں چوہیاں پیپوں کے نیچے بھاگ گئیں۔

"ہوں ـــ تو یہ معاملہ ہے! اچھا کہوں گا امی سے" ـــ بھائی جان شٹک میں کڑوا تیل لگانے گودام میں آئے تھے۔

"بھائی جان! انہوں نے ساری باتیں سن لیں۔ چپ رسولن آپا چلو" دونوں دبک کر نکلنے لگیں، ایک نفرت سے بھائی جان کی ہاکی اسٹک گھورتی پرانے پلنگ کے بانوں میں بھاگ گئی۔

"کیا آپ ـــ اچھا تو کہیے سازشیں ہو رہی ہیں ـــ مگر میں نے سب سن لیا ہے۔ وہ دین محمد کی قمیص ـــ مہندی کے نیچے ـــ بھائی جان تیل کی تلاش میں پیپے ٹٹولنے لگے۔

تو ـــ تو آپ ـــ دیر سے کھڑے تھے؟" سلمہ نے چاہا اس کے چہرے کی سفیدی آنچل میں جذب ہو سکے تو کیا کہنے!۔

"اور کیا برآمدے میں تھا میں ـــ اب تم پکڑی گئیں ـــ بتاؤ کیا سازش تھی؟"

"بھائی جان ـــ"

"کچھ نہیں سچ بتا دو ورنہ ابھی امی سے جا کر کہتا ہوں ـــ بولو کیا

بات ہے ۔۔۔"

"اچھے بھائی جان ۔۔۔ دیکھئے غریب رسولن ۔۔ ہائے اللہ ۔۔"

نزہت کا جی چاہا زور سے چنے کی گولی سے ماتھا پھوڑ ڈالے۔

"یہ رسولن ۔۔۔ سورنی ہے۔ میرے سارے جوتے پلنگ کے نیچے بھر دیتی ہے، اس چڑیل کی کھال کھچوا دوں گا۔ بھٹر جا ۔۔ کیا گا مر کر آتی ہے ۔ شرطیہ ۔۔"

"نہیں بھائی جان ۔۔ اچھا آپ قسم کھائیے کہ کہیں گے نہیں کسی سے" ۔۔ سلمہ نے بڑھ کر پیار سے بھائی جان کے گلے میں باہیں ڈالدیں۔

"ہٹو ۔۔ نہیں کھاتے ہم قسم ۔۔ مت بتاؤ ہمیں ہم خود جانتے ہیں آج سے نہیں کئی دن سے ۔۔"

"ہائے ۔۔ میرے مولے ۔۔" رسولن اوندھی پڑ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"اچھے آپ ہمارا ہی مرا منہ دیکھیں جو کسی سے کہیں ۔۔ سنئے ہم سب بتادیں گے" ۔۔ دوسری طرف سے نزہت نے گلا دابا۔

"بات یہ ہے ۔۔" اور کان میں سلمہ نے کھسر پسر کچھ بتانا شروع کیا۔

بولے "۔ ارے ۔۔ اکب ۔۔" بھائی جان کی ناک پھڑ کی اور بھویں ٹیڑھی میڑھی لہریں لینے لگیں۔

"کل شام کو ۔۔" نزہت نے ہولے سے بتایا۔

"ابا جان کلب گئے تھے۔ اور امی سو رہی تھیں ۔۔" سلمہ کے گلے میں سوکھا

آٹا پھنسنے لگا۔

"ہوں ۔۔۔ پھر ۔۔۔ اب کیا انہیں پتہ نہیں چل جائے گا ۔۔۔" بھائی جان دونوں کو جھٹک کر بولے۔

"مگر آپ ۔۔۔ آپ نہ کہیئے گا ۔۔۔ آپ کو رضیہ آپا کی قسم ۔۔۔" سلمہ نے کہا۔

"رضیہ ۔۔۔ رضیہ" ۔۔۔ ہیں! ہشت ہٹو ۔۔۔ ہم کسی کی قسمیں نہیں کھایا کرتے ۔۔۔" اور وہ ہاتھ جھٹکتے چلے ۔۔۔ "ہم ضرور کہیں گے۔ واہ ہٹو ہم جا رہے ہیں ۔۔۔"

"آپا تم بھی کیا ہو ۔۔۔ اتنی زور زور سے بولتی ہو کہ سب انہوں نے سن لیا ۔۔۔" بھائی جان کے جانے کے بعد تو سلمہ کی آنکھیں آنسوؤں میں غرق ہو گئیں"۔ یہ بھائی کسی کے نہیں ہوتے۔ سوئٹر بنوائیں، بٹن لگوائیں وقت بے وقت انڈے تلوائیں روپیہ ادھار لے جائیں اور کبھی بھول کر بھی واپس نہ کریں۔ کیا مسکین صورت بنا لیتے ہیں۔ جانو بڑی مصیبت پڑی ہے۔

"نزہت گڑیا ذرا ایک روپیہ ادھار دے دو، سچ کہتا ہوں کل ایک کے بدلے دو دیدوں گا ۔۔۔ ہوں اور دُگنے تو دُگنے ذرا اصل ہی دے دیں تو بہت جانو" ۔۔۔ نزہت بالکل ہی بغاوت پر تل گئی۔

رسولن کی ماں روٹیوں کے لئے خشکی لینے آئی ہے۔ غریب کے سارے منہ پر جھریاں پڑی ہوئیں تھیں اور چہرے سے نفرت و غصہ برس رہا تھا۔

"ارے رسولن کی ماں اس کا بخار نہیں اترتا۔ تم کچھ کرتی بھی نہیں۔"

"ارے بیٹا کیا کروں ــــ حرام خور نے مجھے تو کہیں کا نہ رکھا۔ جہاں نوکری کی اسی کے گنوں سے نکالی گئی ــــ گھڑی بھر کو چین نہیں
"مگر رسولن کی ماں تم چاہو کہ وہ مر جائے تو دیکھ لینا تم بھی چھوٹو گی نہیں یہاں اور کیا ــــ"

"مر جائے تو پاپ ہی نہ کٹ جائے۔ کلموہی نے مجھے منہ دکھانے کا نہ رکھا۔ بھگانے والی تو اب بھی مجھے رکھنے کو کہتی ہے، پر اس اگیّنی کے مارے کہیں نہیں جاتی ــــ جب دیکھو مجھے تو نصیبوں کا رونا ہے ــــ جوان بیٹا چل دیا اور یہ ماری گئی رہ گئی۔ میرے کلیجے پر مونگ دلنے کو۔"
"تو زہر دے دے نا مجھے ــــ ہو ــــ ہو ــــ ہو ــــ" رسولن نے بے بسی سے رو کر کہا۔
"ارے میں کیا دوں کی زہر، ان کرتوتوں سے دیکھ لیجو جل جائے گی اور وہیں سڑ سڑ کے مرے گی۔ لو اندھیر خدا کا مجھ سے کہا تک نہ اس نے۔ ہٹو بی مجھے اکتا لینے دو۔"
"یہ کیا ہو رہا ہے یہاں ــــ سلمہ ــــ نزہت! ہوں کتنی دفعہ کہا کہ شریف بیٹیاں رذالوں کے پاس نہیں اٹھتیں بیٹھتیں مگر نہیں سنتیں۔ جب دیکھو سر جوڑے باتیں ہو رہی ہیں ــــ جب دیکھو دکھڑے روتے جا رہے ہیں ــــ چلو یہاں سے نکلو ــــ ادئی اسے ہوا کیا جو لاش بنی پڑی ہیں۔ بنو!"
"جی ــ جی ــ بیوی جی بخار ہے کمبخت کو ــــ" رسولن کی ماں جلدی

جلدی آٹا چھاننے لگی۔

"بخار تو نہیں معلوم ہوتا۔ خاصہ طباق سا چہرہ رکھا ہے۔ یہ کیوں نہیں کہتیں کہ بنتو ——"

"بیوی جی! یہ دیکھئے یہ ——" دین محمد بیچ میں چلایا ——

"آپا —— وہ —— وہ لے آیا ——" سلمہ نے جیسے قبر سے اکھڑی لاش کو دیکھ کر بزدلی گھگیانا شروع کر دیا اور نزہت سے لپٹ گئی ——

"ارے کیا ہے؟" ——

"یہ، دیکھئے پچھواڑے مہندی کے تلے"

"ہے ہے —— کمبخت —— اوئی ——" اماں جان کے ہاتھ سے لوٹا چھوٹ پڑا، وہ مری ہوئی چوہیا تو دیکھ نہ سکتی تھیں ——

"بس —— یہ اس نے رسولن نے بیوی جی —— مہندی کے تلے گاڑا —— یہ دیکھئے ——" رسولن کا جی چاہا وہ بھی ننھی سی چوہیا ہوتی اور سٹ کے مٹکوں کے نیچے خلا میں جا چھپتی۔

"چل جھوٹے —— کیسا بن رہا ہے —— جیسے خود بڑا معصوم ہے" —— نزہت چلائی۔

تو کیا میں نے مارا ہے واہ صاحب واہ —— وہ نزہت بی، اور پھر اپنی ہی قمیض میں لپیٹ دیتا کہ جھٹ پکڑا جاؤں —— بیوی جی یہ رسولن نے گاڑا"

"چل نامراد تجھے کیسے معلوم میری بچی نے گاڑا ہے، تیری اماں بھینا

نے گاڑا ہو گا لو! اور میری لونڈیا کے سر بھتوپ رہا ہے، اس کا جی پرسوں سے اچھا نہیں ہے۔ الگ پڑی ہے کوٹھری میں" رسولن کی ماں دہاڑی اور زور سے چھلنی سے آٹا اڑانے لگی۔ تاکہ سب کے دم گھٹ جائیں۔ اور بھاگ کھڑے ہوں۔ وہ اپنی پیٹھ سے رسولن کو چھپائے رہی کتنے ہیں۔ دلائی نے اس کے گلے میں ٹانسلس گھنگول دیا تھا۔ جبھی تو ایسا چینی تھی۔ محلہ کی زیادہ تر لڑائیاں وہ صرف اپنے گلے کے زور سے جیت جایا کرتی تھی۔

"سرکار میں شرط بدتا ہوں۔ اسی کا کام ہے یہ — یہ دیکھیے میری قمیض بھی چرا کر پھاڑ ڈالی، جانے دوسری آستین کہاں گئی" — دین محمد بولا

"حرامخور اسی کا نام لیے جاتا ہے، کہہ دیا پرسوں سے تو وہ پڑی مر رہی ہے۔ مرغیاں بھی میں نے بند کیں اور اپنے ہاتھ سے گودام کی جھاڑو نکالی موا کام ہے کہ دم کو لگا ہے —" رسولن — یاں جھوٹ پیچ اڑانے لگی۔

"اسی لیے تو کمرے کیے پڑی ہے ڈر کے مارے، ورنہ ہمیں کیا معلوم نہیں — اس کا مرض، چپکے سے گاڑ آئی کہ سرکار کو معلوم ہو گیا تو جان کی خیر نہیں"

بیوی جی جوتیوں میں سے پانی ٹپکانے لگیں "اس چیڑیل سے تو میں تنگ آگئی ہوں۔ رسولن کی ماں یہ کپڑوں بھرا کباب میں گھڑی بھر نہیں رکھنے کی۔ لو بھلا غضب خدا کا ہے کہ نہیں"

"سور کہیں کا — یہ دین محمد" سلمہ بڑبڑائی۔

سلمہ نہ جانے کیا بڑبڑائی کہ اماں جان نے ڈانٹ بتائی۔

"بس بی بس تم نہ بولو کہہ دیا کنواریاں ہر بات میں ٹانگ نہیں اڑایا کرتیں — چلو یہاں سے تمہارا کچھ بیچ نہیں — رسولن کی ماں بس آج ہی اسے اس

کی خالہ کے یہاں پہنچا، کتنا کہا حرامخور کا بیاہ کردے کہ پاپ کٹے۔" بیوی جی بُری طرح طعنے دینے لگیں۔

"کہاں کر دوں بیوی جی، آپ ہی تو کہتی ہیں کہ چھوٹی ہے، سرکار کہتے ہیں ابھی نہ جیل ہو جائے گی۔ اور میں تو موئی کی کر دوں کوئی قبولے بھی، مجھے تو اس نے کہیں مُنہ دکھانے کا نہیں رکھا۔" رسولن کی ماں رو رو کر چھلنی جھاڑنے لگی۔

"اری اور یہ مرا کیسے۔ رسولن ذرا سی جان کو تو نے مسل کر رکھدیا اور تیرا کلیجہ نہ دُکھا۔

"اُونھ اُونھ اُونھ ——" بچاری رسولن کچھ بھی نہ بتا سکی۔

"بن رہی ہے بیوی —— بڑی ننھی سی ہے نا —" دین محمد پھر ٹپکا۔

"اؤں اوں اللہ قسم بیوی جی —— یہ —— یہ دین محمدؐ۔"

"لگا دے میرے سر —— اللہ قسم بیوی جی یہ اس کی حرکت ہے جھوٹی ——"

"خدا کی مار تجھ پر، جھاڑو پیٹے ایک، سال سے، میری لونڈیا کا نام لئے جاتا ہے۔ بڑا ساہوکار کا جنا آیا وہاں سے، ہر وقت میری لونڈیا کے پیچھے پڑا رہتا ہے —— رسولن کی ماں اپنی مخصوص جنگھاڑ میں پھٹ پڑی۔

"بس بس جب تک بولتی نہیں بڑھتی ہی جاتی ہیں —— تمہاری لونڈیا سے بھی بڑی سیدانی ——"

"دیکھو دین محمدؐ کی ماں، تمہارا کوئی بیچ نہیں۔ زمانہ بھر کا لچا مولا ——"

"بیچ کیسے نہیں اور تمہاری لونڈیا —— ابھی جو دھر کے سارے پول کھول

دوں تو بغلیں جھانکتی پھرو، کہو کہ لؤ کر ہو کر لؤ کر کو اگاڑتی ہیں ـ" رسولن کی ماں چنگھاڑ سکتی تھی تو دین محمدؐ کی ماں کی نحیف مگر ایک ۔ کی آواز کانوں میں مسلسل پانی کی دھار کی طرح گر گر کر پتھر تک کو گھس ڈالتی تھی۔ پیں چیں چیں جب شروع ہوتی تھی تو معلوم ہوتا تھا، دنیا ایک پرانا چرخہ بن گئی ہے۔ جس میں کبھی تیل نہیں دیا گیا۔

"آیا لنگوڑا مارا کہیں سے ــــ"، رسولن کی ماں دب نہیں رہی تھی ذرا یونہی کچھ سوچ رہی تھی" اور کیا ننھی بن کر میرے لونڈے کا نام لے رہی ہے۔ جیسے ہم سے کچھ چھپا ہے۔ پچھلے جاڑوں میں بھی اسی نے ایسے ہی جھٹ پٹ کر دیا اور کانوں کان خبر نہ ہوئی اور تم خود چھپا گئیں میرا لڑکا موی پر تھوکتا بھی نہیں "

"دیکھئے بیوی جی اب یہ بڑھتی جا رہی ہیں۔ موئی قصائن کہیں کی

مارا چلو، اچھے چٹ پٹ کیا کوئی تمہارے خصم کا تھا ــــ"

"میرے تو نہیں ہاں تمہارے خصم کا تھا جو پوٹلی باندھ اندھے کو تیں جھونک آئیں اور لونڈیا کو جھٹ سے خالہ کے بھیج دیا۔ ذرا سی فتنی اور گُن تو دیکھو" ــــ دین محمدؐ کی ماں کی آواز لہرائی۔

"بس جی بس یہ کنجو خانہ نہیں ــــ نہ تمہارے خصم کا نہ ان کے خصم کا چلو۔ اپنا اپنا کام کرو ــــ بھلا بتلاؤ سرکار کو پتلا چلا تو ــــ اللہ جانتا ہے قیامت رکھی سمجھو ــــ ٹانگ برابر کی چھوکری کیا مزے سے مار موڑ ٹھکانے لگا دیا اور پھوپ بھی آئی ــــ اندھیر ہے کہ نہیں ــــ اے ہے چل ہٹ اُدھر

—بیوی جی جلدی سے لپکیں۔

"کچھ نہیں ابا میاں یہ رسولن — بھائی جان ہاکی اسٹک پر اب تک تیل مل رہے تھے:"

"اے چپ بھی رہ لڑکے، کچہری سے چلے آتے ہیں، آتے ہی جھلا جائینگے یہ دیکھئے سرکار — یہ مار کر چھوا اڑے گاڑ آئی — میں نے آج دیکھا —"

"ارے!!! — ادھر لانا — افوہ — یہ کس نے — مارا۔"

"سرکار رسولن نے — وہ اندر بیٹھی ہوئی پڑی ہے۔"

"او مُردے کیوں جھوٹے بہتان جوڑتا ہے، بجلی گرے تیری جان پر —" رسولن کی ماں دانت پیستی جھپٹی۔

"مُردی ہوگی تیری بہینی جس کے یہ کرتوت ہیں — لاڈ کے گن تو دیکھو —"

"چپ رہو کیا بھٹیاریوں کی طرح چیخ رہی ہو —" سرکار رعب سے غرائے اور سارے میں سناٹا چھا گیا — "ابھی پتہ چلا جاتا ہے۔ بلاؤ رسولن کو —"

"سرکار — حضور! —" رسولن کی ماں لرزنے لگی۔

"بلاؤ — باہر نکالو سب معلوم ہو جائے گا —"

"سرکار جی اچھا نہیں نگوڑی کا —" بیوی جی اُٹھیں حمایت کرنے۔

"جی رہی سب اچھا ہے — بلاؤ اُسے —"

"رسولن اور رسولن — چل باہر سرکار بلاتے ہیں" دین محمد داروغہ کی طرح چلّایا۔

"رسولن گھٹی گھٹی آہیں بھرنے لگی چیخیں رک گئیں اس کے ہونٹ پٹر پٹر بولنے لگے مگر حکم حاکم مرگ مفاجات، کراہتی سسکتی لڑکھڑاتی جیسے اب گر کر جان دی۔ نزہت نے لپک کر سہارا دیا — بخار سے بنڈا تپ رہا تھا اور منہ پر نام کو خون نہیں!

"بن رہی ہے سرکار —" دین محمد اب بھی نہ پسیجا!

"ارے ادھر آ — ادھر، ہاں بتا — صاف صاف بتا دے ورنہ بس۔"

"پولیس میں دے دیں گے سرکار —" دین محمد ٹپکا — اور رسولن کی ماں نے ایک دو ہتڑ اس کی جھکی ہوئی کمر پر لگایا کہ اوندھے منہ گرا سرکار کے پاس!

"جوانا مرگ تجھے ہیضہ سمیٹے —" رسولن کی ٹانگیں لرز رہی تھیں — اور منہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔

ہاں صاف بتا دے ورنہ سچ کہتے ہیں ہم پولیس میں دے دیں گے۔" سرکار بولے۔

"ہچکیوں کی وجہ سے رسولن بول بھی نہ سکی" رسولن کی ہچکی بندھ گئی "بیگم اسے پانی دو — ہاں اب بتا — کیسے مارا —"

پانی پی کر جی تھما ذرا، بڑی دیر تک پانی چڑھاتی رہی کہ جواب سے بچی رہے۔

"ہاں بتا — جلدی بتا —" سب نے کہا۔

"سرکار ——"

"ہاں بتا ——"

"سرکار — اینھ — اینھ — ہو ہو — میں — میں میرے سرکار میں ڈربہ — فر — ڈربہ بند کر رہی تھی — تو کالی مرغی بھاگی۔ میں نے جلدی سے دروازہ بھیڑا — تو — تو یہ پیچ گیا — اوہ اوہ ——"

"سرکار بالکل جھوٹ یہ ایسی بری طرح مرغیوں کو ہکاتی ہے۔ کہ کیا بتائیے" دین محمدؐ کہاں مانتا تھا۔ "منع کرتا ہوں کہ ہولے ہولے"

"چہ چہ چہ، کیا خوبصورت بچہ تھا۔ منارکہ کا تھا۔ ابھی آپ نے کانپور سے منگوایا تھا — ہاک۔ آج اسے رسولن کو کھانا مت دینا۔ یہی سزا ہے اس چڑیل کی۔ اور دین محمدؐ، آج سے مرغیاں تو بند کیا کر، سُنا ——"

"واہ واہ واہ نگوڑی میری لونڈیا کو ہلکان کر دیا۔ صدقے کیا تھا نگوڑا لوٹی کا تنکہ، ذرا سا مرغی کا بچہ اور اتنا شور چل رہی چل۔ آج ہی مردار کو خالہ کے گھر ٹپکوں ایسی جگہ جھونکوں (دھپ! ٹیں، رسولن کی آواز) کہ یاد ہی کرے اجیرن کر دی۔ میری زندگی۔ منہ کالا کروادیا ——"

رسولن کی سسکیاں اور ماں کے کوسنے عرصہ دراز تک ہوا میں رقصاں رہے۔:۔

نفرت

اُسے تو اسی دن سے اس سے نفرت ہو گئی تھی۔ جس دن ممانی رات بھر چیخی تھی اور صبح چار بجے وہ پیدا ہوئی تھی۔ لوگوں نے اس سے کہا کہ بچی ہسپتال کی میم صاحب دے گیئں تھیں۔ مگر وہ ان بہلاؤں میں ذرا کم آتا تھا اور ہسپتال کی میم صاحب جلے کنڈے کی شکل کی چمگادڑ معلوم ہوتی تھی۔ وہ اتنی لال کترنچی لا ہی نہیں سکتی تھیں۔

مگر یہ بچی اسے بہت ہی بُری لگی گندی اور نرم۔ اس نے کرتا اٹھا کر اس کا نال دیکھا اور اس کا جی متلانے لگا۔

"ایخ تھو!" وہ منہ بناتا ممانی کے پلنگ سے اُتر آیا اور جب اس بچی کا سر مُنڈا تو وہ بالکل گنجے قصائی کی شکل کی لگنے لگی۔ جھریوں دار منہ، پگلی خالہ جیسا اور ذرا سا پیٹ جھوٗ دو تو مکوڑے کی طرح ہاتھ پھیلا کر ہوا کو نوچنے لگتی۔

اور پھر وہ موٹی ہونی شروع ہوئی اور ممانی سوکھنے لگی۔ صبح شام وہ کلّا پھاڑ پھاڑ کر دہائی دیتی رہتی اور جب تک ممانی اسے دوپٹے میں چھپائے۔ دودھ نگلایا کرتی۔ وہ چپ رہتی یا تار کے بنے ہوئے ہنگورے میں ٹانگیں۔

بچو کھونٹی کیئے سوتی رہتی۔ اس کے یہی گُن دیکھ کر شاید اس کی ماں اسے اپنی بہو بنانے پر تیار ہو گئی تھی۔

"میرے منّو کی دُلہن، میری لاڈو" اماں اسے ممانی سے لے کر گھٹنوں پر لِٹاتی اور وہ اپنی گھومتی ہوئی آنکھوں کو ٹھہرا کر کاٹھ کے اُلّو کی طرح تکتی اور منّو پر بغاوت طاری ہو جاتی۔ اس کا جی چاہتا کوئی اس گوشت کے لوتھڑے کو چیل چلور کر دے۔ کوؤں کو کھلا دے۔ اس نے ایک نہیں ہزار دُلہنیں دیکھی تھیں۔ پر اتنی ذلیل دلہن کا ہے کو دیکھی ہو گی۔ رال تھی کہ اس کے منہ سے نالی کی طرح بہے جاتی۔ اور سارے دلان میں پوترے تکونیاں پھیلی مہکا کرتیں گھٹنوں بھنگن اس کے اعمال دھوتی اور منّو کو بھنگن کے لئے نل کھولنا پڑتا۔ وہ منہ بناتا بسورتا ناک موڑے جا کر نل کھول کر واپس لوٹ آتا۔

اس بچی کے خلاف اس کے دل میں بغاوت بڑھتی ہی گئی، کمبخت بیمار بھی تو نہ ہوتی۔ منّو کا جی چاہتا اسے نمونیا ہو یا چیچک نکلے اور وہ مرے یا کم از کم اپاہج ہو جائے۔ اس کا جی چاہتا۔ اُس کا موٹا سا دودھ بھرا پیٹ پھاڑ ڈالے کئی مرتبہ اس نے ارادہ کیا کہ بڑا سا پتھر اٹھا چپکے چپکے جائے اور دھم سے اس پر پٹخ مارے مگر عین وقت پر یا تو کوئی ادھر آ جاتا یا وہ خود ہی جاگ کر چلانے لگتی یا پتھر بھاری ہوتا۔ ایک دن اس نے اس پر برآمدے میں کھڑا ہوا پلنگ گرانے کی ٹھانی، وہ چپکے سے پلنگ کے پیچھے گیا اور بڑے تاک کے سوچا ایک ہی دھکے میں اسے اس کے پنگوڑے پر الٹ دوں مگر پھر عین وقت پر بچی کی ناک میں مکھیوں نے پَر ڈال کر جگا دیا اور وہ زور سے چھینکی اور منّو لرز کر پلنگ

کے پیچھے سے بھاگا۔ ارے بڑی چالاک تھی وہ!

اور پھر وہ ذرا بڑی ہوئی تو اس نے وبا کی طرح ہر وقت گھر میں رینگنا شروع کیا۔ کبھی وہ زمین پر اوندھی لیٹ کر مٹی چاٹتی کبھی جوتیاں اٹھا کر چچوڑتی اور کبھی کتے کی کونڈیلی میں منہ لگا کر پانی پینے لگتی۔ برسات میں تو بس ذرا سا پانی پڑا اور وہ چھک کر رینگی۔ ہر پانی کے ننھے سے گڑھے میں چھپا چھپ اپنا موٹا ہاتھ پھیلا کر مارتی اور ساری کیچڑ منہ پر مل لیتی اور رہی ہی ہنستی۔

"ارے منّو بھیّا ذرا اسے ہٹا تو دے وہاں سے۔"

ہونہہ! منو اور اس کتیا کو چھوئے، وہ خاموش غرور سے اپنی کتاب پر نظر جمائے اکڑا بیٹھا رہتا۔

"میرا بھیّا کیسا۔ سردی لگ جائے گی موٹی کو۔۔۔ ذرا اٹھالا"۔ ممانی گڑگڑاتی۔

"اے اٹھتا ہے کاہل مٹس کہ نہیں۔۔۔" اس کی امّاں چلائی اور جل بھُن کر اس کے کباب بن جاتے، وہ کتاب پٹخ کر اٹھتا۔ جی چاہتا اسے اٹھا کر اسی گڑھے میں گڑو دے۔ مگر خیر وہ اسے گندی مینڈکی طرح اٹھاتا۔

"اسے نوج یاں کہاں میری صورت پر لئے آتا ہے۔ بھیّا ذرا نل کے پاس لے جا کر نہلا دے۔۔۔"

نل کے پاس لے جانے کے بجائے وہ چاہتا اسے کسی گہرے تلاؤ میں ڈال دے مگر مجبوراً وہ خاموشی سے اسے نل کے پاس لے جاتا۔ اب وہ مچل جاتی۔ نل کی دھار پکڑتی۔ کبھی چھینٹیں اڑاتی، کبھی کچھ کرتی اور اسے

اٹھانے کے بعد منّو خود کیچڑ میں لتھڑ جاتا۔

"اے ہے کپڑے تو دیکھ اپنے — کیا ناس لگایا ہے اجلے کُرتے کا"— الٹا اسی پر الزام منسوب دیا جاتا، وہ کم سخن تھا اس لئے صرف پیر پٹختا چل دیتا۔

پھر اور بڑھی اور بڑھی اور خاصی بلائے جان ہو گئی۔ لوگوں نے اس کا نام فخر النساء رکھا! مگر وہ اپنی جنس کے لئے اسی طرح باعث شرم رہی۔ ذلیل سست، کام چور، یا تو جھولا جھول رہی ہے یا ہجولیوں کیساتھ اوڑھنی کا برقعہ بنائے عورتوں کے پکے پکے کھیل کھیل رہی ہے۔ اگر کبھی وہ ادھر سے گزر ہوتا تو وہ شرما کر لڑنے لگتی۔ دنیائے جہان کی لڑکیاں سر جھکایا کرتی ہیں پر وہ جبڑا پھیلا کر کڑک مرغی کی سی آواز نکالتی اور بھتنی کی طرح منمناتی۔

"ایں — جاؤ منو بھیا ہم اماں سے کہدیں گے —" جیسے وہ اسے اور اس کی چڑیل دوستوں کو تاکنے آیا تھا — وہ غرور سے ایک طرف گردن اکڑ کر چلا جاتا۔

"ہماری گڑیا کا بیاہ ہے ہمیں دھنک لادو —" وہ حکم چلاتی۔

"کیسی دھنک؟ ... کیسی دھنک؟" وہ بیوقوفوں کی طرح غصّہ ہوتا۔

"ایلو منّو بھیا دھنک نہیں جانتے ... ہی ہی ہی ..." وہ کمینی سہیلیوں کے ساتھ ہنستی "اے وہی دو پیسے کی دھنک"

"بھاگ جاؤ یہاں سے" وہ منہ پھیر لیتا۔

"اُوں.... بھیّا کیسے، لادونا۔" اور منو کو غصہ چڑھتا۔ وہ کمزوری سی محسوس کرتا۔

"ارے تو کیسی دھنک بتا بھی کچھ...."

"لو، تم بس یہ دوپٹہ دکھا دینا دکاندار کو اور کہنا دو پیسے کی دیدے۔"

ہونھ تو وہ یہ لال لوٹل کا دوپٹہ جیب میں رکھ کر لے جاتے وہ دوپٹہ جیسے وہ جوتوں کے پونچھنے کے لئے بھی میلا سمجھتا ہو۔ وہ نفرت سے دوپٹہ جھٹک دیتا۔

"مر ہی جاؤ اللہ کرے — آں لے کے پھینک بھی دیا!"

وہ موٹے موٹے گال اور پھیلا لیتی مگر وہ دو پیسے کی دھنک لا دیتا۔ کیا کرتا اور؟ اور نہایت بے رخی سے ماتھے پر شکنیں ڈالے وہ اسے دھنک دے دیتا۔

"دیکھو جی فخرن کو کوسا پیٹا نہ کرو جلاہیوں کی طرح — لو — بس!"

اور وہ دھنک لیکر نہایت خود غرضی سے ٹھٹھے لگاتی چل دیتی۔ کسی کا احسان ماننا تو اس کی گھٹی ہی میں نہ پڑا تھا۔ خود غرض کہیں کی۔ ہمیشہ کی خود غرض تھی۔ اس کی خود غرضی ہی سے منو جلتا تھا۔

لیکن جب اس کے بھائی اس کے ٹھیک کرنے پر اتر آتے تو منو کو مزا آجاتا۔ رفیق اس کا گھروندا بگاڑ دیتا اور ساجد اس کی مٹی کی کلھیاں پھوڑ دیتا۔

"آؤ منو فخرن کی گڑیاں جلائیں — منو کا جی کھل اٹھتا اور دونوں

مل کر ٹین کی صندوقچی میں سے میلے کچیلے چیتھڑے نکال کر مٹی کا تیل چھڑکتے اور آگ لگا دیتے۔ جب فخرن کو معلوم ہوتا تو وہ ایسے چیختی گویا وہ ۔رانڈ ہوگئی یا اس کے جوان بیٹے مر گئے۔

"اللہ کرے کیڑے پڑیں ... ہیضہ ہوئے، طاعون لے جائے ..." مگر وہ منڈیروں پر چڑھے فتحمندی سے مسکرایا کرتے۔ ذرا جو پروا کر جائیں۔

"اللہ کرے کھڑے کھڑے دم نکل جائے .... آدھی رات کو جنازہ جائے"

"کتے لاشیں نوچیں!" اب یہ حد ہوتی۔ چڑیل کو کوسنے کتنے بھیانک آتے تھے

"کفن نہ نصیب ہو، قبر میں بجو کھائیں ...." منو کو اور اس سے نفرت ہو جاتی اور ساجد حقارت سے مسکرانے کی کوشش کرتا۔

"کوڑھ پھوٹے ..." منو کو پھر یریاں آنے لگتیں اور ساجد کی بھویں تن جائیں۔

"آنکھیں پٹم ہو جائیں ...." فخرن کی لعنت بڑھتی ہی جاتی اور منو اور ساجد کی طبیعت زیادہ مکدر ہوتی جاتی۔ وہ خود پر ترس کھانے لگتے اور کچھ شکست سی کھانے لگتے۔

"اری او فخرن کی بچی چپ بھی کہ لگاؤں آکے جوتیاں۔ لوگو سے ہی چلی جاتی ہیں لاڈھو۔ صدقے کر دوں ایسی لونڈیا کو ___" اور وہ دانت پیستی برابر چپکے چپکے کوستی رہتی۔ یہاں تک کہ ممانی اسے مارنے اٹھتی۔ ایسے موقعوں پر منو کی اماں ضرور دخل دیتی۔

"لے دلہن کھائے لیتی ہو لونڈیا کو۔ موئے لڑکوں کو نہیں دیکھتی۔ لے کے

اس کی گڑیاں جلادیں مارے گیوں نے . . . تو میری بنّو! میں تجھے اور بنا دوں گی۔ اور فوراً بقچیا نکال کر اُلٹے سیدھے چیتھڑے نکلنے لگتے۔ فخرن آنسو پونچھ کر پاس جا بیٹھتی۔

جوں جوں گڑیا بنتی جاتی۔ فخرن میں جان پڑتی جاتی اور منو کا خون کھولنے لگتا۔ اماں نے تو بس لاڈ میں اسے پیدا ہوتے ہی خراب کرنا شروع کر دیا تھا۔ خیر دیکھنا ہے کہ وہ کہاں تک جاتی ہیں۔ منّو نے سوچ رکھا تھا کہ اگر اب کے انہوں نے اسے بہو بنانے کی دھمکی دی تو ساری گڑیاں تو الگ رہیں اس کی سرخی مخمل کی جوتیوں اور گلابی کریب کی اوڑھنی کی خیر نہ سمجھو! بس چھوٹے گنڈی کی کپچڑیں کوئی تار ملے تو ملے۔

اور پھر پھندرن کی مسلمانیوں میں جارہی تھی۔ ٹیکا لگائے، بقچہ بتی چلتے چلتے زبان نکال کر "ای ای" کرتی پھدک کر ڈولی میں بیٹھ گئی۔

"اماں اس نے منہ کیسے چڑایا — مار کے رہوں گا سور یا کو..." وہ ڈولی کا پردہ پکڑ کر اَڑ گیا۔

"لڑکے ہوش میں، کب چڑایا اس نے تیرا منہ، واہ —! بچکی میرے ساتھ آئی ہے. . . ." اماں نے حمایت لی اور وہ بھولے بھولے گالوں پر بھولپن لانے کی کوشش کرنے لگی۔

"ابھی چڑایا تھا اس نے . . . مار وں گا میں اسے"

"اے چل ادھر، آیا بڑا مارنے والا — اٹھاؤ جی کہار و ڈولی —" اور پھر ایک دفعہ ناک سکیڑ کر اس نے ڈولی اُٹھتے اُٹھتے منہ چڑا دیا۔ اماں نے

دیکھا مگر پیار سے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر ہنس دیں۔ ڈولی چلی گئی مگر منو شام تک جلتا رہا۔

پھر اس سے ہر وقت لڑائی رہتی۔ سارے گھر کی لڑائی ہوتی۔ ساجد سے زبان چلاتی۔ رفیق کو کوستی۔ محمود کو گھسونٹی اور منو کا منہ چڑاتی۔ منو کا بس چلتا تو اینٹا لے کر اس کا منہ اتنا کچلتا کہ ہونٹ آٹا ہو جاتے۔ دانت جھڑ جاتے اور پھولے ہوئے گال خون خون ہو جاتے۔ مگر اماں کہتی تھیں "خبردار جو لڑکی پہ ہاتھ اٹھایا۔ کیا سمجھا ہے، ہاتھ توڑ کے رکھ دوں گی!" خیر ہاتھ تو وہ کیا توڑ سکتی تھیں کسی کے چوہیا کا پنجہ بھی نہ مروڑ سکیں، سوکھی ماری کھانستی ہوئی اماں مگر غرور پہلوانوں جیسا! اور اس غرور کے سائے میں فخرن کوڑی کام کی نہیں رہی۔

"میں منو بھیا سے بیاہ بھی نہیں کروں گی۔ اتنے سوکھے مارے پودنے جیسے ہیں —" وہ منہ اترا کر کہتی۔

"چپ چڑیل لڑکیاں نہیں بولا کرتیں" — ممانی ہنس کر ڈانٹتی۔

"واہ تو کیوں کروں ان سے، پھوپی اماں میں تو سجو بھیا سے بھی نہیں کروں گی، وہ کالے ہیں، دوسرے میری گڑیا کا دوپٹہ چراتے ہیں۔ نہ میں رفیق بھائی جان سے کروں — نا بھیا میں تو کسی سے بھی نہ کروں۔ سب بڑے رفیق بھئی جان کی اتنی لمبی ناک، ہی ہی ہی" اور سب ہنستے مگر منو کا جی چاہتا کہ لکڑی ہو مضبوط سی اور یہ لڑکی! گویا وہ سب تو اس کتیا سے شادی کرنے کو مرے جاتے تھے نا۔

"اری تو پھر کس سے کرے گی —" اماں اسے چڑاتیں۔

میں تو صوفی سے کروں گی ـــ ہاں بھیا!" وہ اپنے سگے چھ مہینے کے بھائی سے ناجائز رشتہ کرنے کو تیار ہو جاتی اور منو کے دل میں نفرت کا ایک طوفان اٹھتا۔

"منو بھیا کی دلہن ـــ اے منو بھیا تمہاری دلہن کہاں ہے"! جب سے وہ ایک شادی میں گئی تھی۔ ہر وقت دُلہنوں کا ذکر کرتی۔

"بھاگو یہاں سے"۔ منو نفرت سے بولا۔

"اوں تو بتاتے کیوں نہیں ـــ کیا کنوارے ہی بیٹھے رہو گے سداں ـــ" وہ بوڑھیوں کی طرح ہتھیلی پر گال رکھ کر کہتی۔

"جاتی ہو کہ نہیں ـــ اماں دیکھو یہ فخرن نہیں مانتی، پھر میں مار دوں گا اسے"!

"بس ہاتھ ہی چلتا رہتا ہے ـــ کر کیا رہی ہے تیرا، وہ بیچاری تو بیٹھی ہے ـــ"

"میں پوچھ رہی ہوں پھوپی اماں کہ تمہاری دلہن کہاں ہے"! اور ساری عورتیں ہنسنے لگیں۔

"اری آئینہ میں جاکے دیکھ مُنو کی دلہن کو ـــ" اور منو کے چنگاریاں لگیں۔

"ارے اس میں تو میں ہی ہوں۔ . . . . . اس میں کیوں ہوتی ان کی دلہن ـــ" وہ اتراتی ہوئی آئینہ دیکھنے لگی۔ اتنے میں منو کا پیمانہ لبریز ہو جاتا اور وہ چلتا اٹھ کر!

"میں کیوں ہوتی بھنگن ہو گی ان کی دلہن۔ کالی کلوٹی بھنگن"! منو کا دل چاہتا

لوٹ کر اس کا ہاتھ مروڑ کر آئینہ چھین لے اور لگائے دو گھونسے کس کس کر مگر وہ نہایت استقلال سے سینہ پھیلائے لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر چلا گیا۔

اس کا جی چاہتا تھا کہ دنیا میں کوئی غم ایسا اس لڑکی کو لگ جائے کہ بس روتے ہی کٹے۔ کوئی فکر، کوئی غم جو اس کی جان کو چمٹ جاتے۔ مگر بس اس کا دل ناحق اداس ہوتا اور الٹی اسی کی جان کو فکریں لگ جاتیں۔ اسے کتنی خوشی ہوئی جب اس نے دیکھا کہ آہستہ آہستہ اب اور لوگوں کو بھی فخرن کی یہ بحار جیسی زندگی شاق گزرنے لگی تھی۔ اسے بھی اب عربی کا قاعدہ شروع کرایا گیا۔ اور کمر بند اور جھاڑ لونگے کناری بخیہ کرنے کو دیئے گئے۔ کیسا مزا آتا۔ جب اسے وہ دو حرفی لفظ ہزار بار رٹنے پر بھی یاد نہ ہوتا۔ اور ملانی جی اس کی کمر میں دھموکے لگاتیں۔ اور اس کی اوڑھنی آنسوؤں اور ناک کے پانی سے لتھڑ جاتی۔ کمر بند سینے میں اس کا ٹکوا نہ لگتا تب نانی اماں اس کی موٹی رانوں میں سوئی چبھو دیتیں۔

"دیکھ تو کیسا سیا ہے اپنا کفن"

اور منّو کے دل میں مسرت کی لہریں اٹھنے لگتیں۔ کمر بند کفن! اس کا جی ترس کھانے کو چاہتا مگر وہ دل کی پھیلتی ہوئی مسرت کے آگے اس پاک جذبے کو کمزور پاتا۔ جان بوجھ کر اس کے جوتیاں لگوانے کو وہ اپنے زین کے نیکر کھدر کی شیروانی اور ایسے ہی سخت کپڑوں میں رفو کرنے کے لئے اسے دیتا۔

"چلو فخرن، یہ بٹن ٹانکو"—— وہ جان کر ایسے کہتا کہ وہ چڑ جائے۔

"نہیں ٹانکتے کوئی تمہارے باپ کے نوکر ہیں۔"

"دیکھو ممانی بی، یہ نہیں کرتی۔ میرا ذرا سا کام بھی۔ کہتی ہے باپ کی نوکر نہیں

"او فخرن کی بچی چل ادھر ___ لٹانگے گی کیسے نہیں ..." اور وہ پھوتھنا پھلا کر بیٹھ جاتی۔

"کتنی تھی باپ کی نوکر نہیں ..." وہ ممانی کو یاد دلاتا۔

"ہوں اب باپ دادا بھی پنّے لگیں بیگم صاحبہ ..." ممانی دانت پیستی اور ایک گھونسا گھم سے پڑتا۔ گھونسوں سے منو کا دل کب بھرتا تھا۔ کاش کوئی اس کی صلاح مانتا اور ایک لوہے کی مضبوط سی موگری بنوالی جاتی تاکہ کچھ معلوم بھی ہوتا کہ ہاں کچھ مار پڑی۔ ورنہ اس کی پرگوشت پیٹھ پہ ایسا ویسا گھونسہ تو بس جیسے مکھی نے لات مار دی۔

اور اگر ذرا بھی کوئی کام بگاڑ دیتی تو سب کے سب پیچھے پڑ جاتے۔

"ذرا چائے سونگھو، ساری لہسن کی بو ہے۔ ساجد اپنی پکوڑا جیسی ناک سکیڑتا۔

"اوہنوں ... یہ انڈوں میں نمک کس گدھے نے ڈالا ہے" رفیق بولتے،

"اور بھنڈی بھی نہیں گلی" اور کہتا۔

"آخر یہ بھرہے کس کرم کی ... بس کھانے کو دیدو دس سیر۔"

بھن بھن کرتی وہ کام کرتی رہتی۔ اور چپکے چپکے سب کے طعنوں کے جواب دیتی۔

"آخر ہم کیوں کریں واہ ... لے کے بوجھ کام ہے ہماری جان پر۔"

"ہاں بس تو تو تخت پر چڑھی بیٹھی رہے" ... ممانی چلائیں اور پھر خالہ اور نانی غرض چاروں طرف سے لے دے ہونے لگتی اور منو کا جی خوش ہو جاتا۔

جب وہ اسکول جانے لگی تو اور انیٹھی جب دیکھو مس ٹامس مس جرمی جب دیکھو سٹڑی سٹڑی کورس کی کتابیں، موزے ٹیڑھے ٹیڑھے بنے جارہے ہیں سارے گھر کو اور بھی چائے میں لہسن کی بو اور انڈوں میں تیز نمک اور کچی بھنڈیاں ستانے لگیں۔ مگر اب وہ اسکول کے کام کی دھمکیاں دیتی۔

"کچھ کام وام نہیں۔۔۔۔ کچھ نہیں ہوتا تمہارے سکول میں ——" وہ ساجد کے ساتھ مل کر کہتا۔

اور تمہارے کالج میں بھی کچھ نہیں ہوتا بس ——! زبان سے تو اس کی سب عاجز تھے۔ حیرت تو اسے جب ہوئی جب اماں ایک دن بولیں۔

"خیر سے اب تم نے امتحان پاس کر لیا۔ اب تمہاری منگنی ہو جائے ہاں اور کیا ——"

منگنی کے نام سے اس دل بلّیوں اچھلنے لگا اور سینکڑوں گورے گورے نازک پتلی انگلیوں والے ہاتھ انگوٹھیاں پہنے اس کے سامنے ناچنے لگے اس کا منہ سل گیا اور وہ کچھ کھو سی گئی۔

"دلہن سے میں نے کہا تھا کہ رجب میں کر دیں گے منگنی؟"

یعنی؟۔۔۔۔ یہ اس کی منگنی اور اس میں یہ کچھ دلہن کا ذکر بھلا معلوم نہ ہوا کہیں کہیں؟۔۔۔۔ مگر توبہ کیجئے، بھلا کیا ہو سکتا ہے۔ اماں اندھی تھوڑا ہی تھیں

"ماشاء اللہ اب جوان ہو گئی ہے۔ کب تک بٹھائے رکھیں گے وہ۔"

"ارے تو پھر۔۔۔ تو پھر —— مگر آخر کیوں؟ یہ جان بوجھ کر کیا اسکی اماں واقعی اُسے قتل ہی کرنے پر تلی ہوئیں تھیں۔

"مگر... مگر اماں —" وہ ہکلایا، سارا منہ سوکھ کر حلق میں کانٹے پڑنے لگے۔

"فخرن کا بھی امتحان ہوئے گا جب تک...."

"بس اب ٹھیک ہے۔"

"اماں.... مگر فخرن...." وہ بولنا چاہتا تھا. کہنا چاہتا تھا کہ کیا۔ "تم گھاس کھا گئی ہو۔ دماغ چل گیا ہے۔ میرا اس کا نباہ بھلا ہوگا،" مگر اس کی اماں بھلا سنتی تھیں. انہیں تو بجائے بیٹے کے وہ گیہوں زیادہ پیارے تھے۔ جنہیں پھٹکنے کے لئے وہ چل بھی دیں۔

منو بچارا، سر پکڑ کر اس نے سوچنا شروع کیا۔

آہ! وہ سارے حسین نازک انگلیوں والے ہاتھ ہوا میں مقتول انسان کے ہاتھوں کی طرح کانپتے ہوئے نظر آئے۔ جن میں سے ایک پر بھی اس کی پسندیدہ وضع کی انگوٹھی نہ تھی۔

وہ بھلا کیسے گزر سکتی تھی۔ اتنی موٹی، کند ذہن لڑاکا۔ بد مذاق ہنسوڑ اور وہ اتنا ڈبلا نازک مزاج، کم سخن اور شریف، بھلا یہ بھی کوئی جوڑ تھا اور پھر وہ بچپن سے اس کے چال چلن طور طریق دیکھتا آیا تھا. کس طرح ممکن تھا کہ وہ یوں خود کو اس طرح دفن ہوتے دیکھے اور چپ رہے. بغاوت کی لہریں اٹھیں اور دل و دماغ کو جھکول ڈالا۔ اس نے ایک نہایت مدلل اور مؤثر

تقریر اماں کے لئے اور ایک نہایت دل شکن اور پُراز طعن و تشنیع مقالہ ممانی کے لئے تیار کیا۔ جس میں اس نے نہایت ہی کٹیلے ہوئے جملوں میں اس اندھی

بے جوڑ شادی کے نقصانات اور فخر النساء کی خوبیاں ظاہر کی تھیں۔

اس نے ایک مرتبہ مشق کی اور چاق وچوبند حسین و لطیف جملوں سے آراستہ ہو کر گھر میں قدم رکھا، ٹاٹ کے پردے کے پاس اس کے پیر زمین نے پکڑ لئے اور وہ کھمبا بن کر کھڑا ہو گیا۔

"اللہ کرے بے گور و کفن لاش سڑے ۔۔۔" فخرن نے بالکل ہی نئے انداز کا کوسنا حال ہی میں ایجاد کیا تھا۔ جسے وہ رفیق کے اوپر آزما رہی تھی۔ منّو کے دل میں اس کی طرف سے تازہ تازہ گرم نفرت کا ابال اٹھا شاید اسے کچھ رحم آجاتا کہ بچاری کی کہاں ہو گی شادی، ناک کٹ جائے گی۔ ڈوب مرنا پڑے گا۔ اگر اس نے ٹھکرا دیا۔ مگر اب تو اس کا دل اور دماغ دونوں ٹھوکر مارنے پر تلے ہوئے تھے۔ جب وہ اندر گیا۔ تو فخرن زینے کی آخری سیڑھی پر بیٹھی دوپٹہ میں منہ چھپائے بھوں بھوں رو رہی تھی۔ کاجل پھیلا ہوا لال چقندر منہ، منّو کا اور بھی جی جلا۔

"تو یہ کون ہوتے ہیں، ہم کسی کو بلائیں، بڑے آئے رقعہ پھاڑنے والے!" وہ کہہ رہی تھی۔ بات یہ ہوئی تھی کہ فخرن اپنی سہیلیوں کو جھولا پارٹی میں بلا رہی تھی۔ اور ان جھولا پارٹیوں سے گھر کے لڑکوں کا دم نکلتا تھا۔ سارے دن کے لئے گھر میں پردہ ہو جاتا تھا۔ مگر گھر کی ہر کھڑکی اور دروازے سے وہ مہذب

خواتین جھانک جھانک کر لڑکوں کا مذاق بناتی تھیں۔

"بجّو کہہ رہی تھی۔ رفیق بھائی جان کی صورت اشوک کمار سے ملتی ہوئی ہے اور رفیق بیچارے کے کان سرخ ہو جاتے۔ فخرن کو شبہہ ملتی۔

"اجمل آپا کہتی تھی۔ منو بھیّا ینولے سے ملتے جلتے ہیں، چپکے اور گھنّے۔"

"ساجد کا پتلون کیسے لٹکتا ہے؟ فہمیدہ کہتی تھی جیسے بھیگا ہوا تنبو..... ہی ہی....."

اور منو، رفیق، ساجد، محمود سب کے سب مغموم ہو جاتے۔ ان لڑکیوں کی رائے سن کر ان کے دلوں میں بغاوت کا جوش اٹھتا تھا۔ اور جی چاہتا تھا سب کو قتل کر دیں۔ مگر پھر بھی جس دن لڑکیاں جمع ہوتی تھیں۔ رفیق بھائی جان صبح ہی سے شیو کرنا شروع کر دیتے اور ساجد اپنی پتلون کی شکنیں مٹانے کے لئے اُسے تکیے کے نیچے دبا دیتا۔ پھر بھی جب وہ برآمدے میں سے گزرتا تو اسے یہی معلوم ہوتا کہ من بھر کا بوجھ پتلون میں بندھا ہے۔ اور نیچے ڈھلکی جا رہی ہے۔ لڑکیوں کے کھلکھلانے کی آواز سن کر منو کی ناک آپ ہی آپ ہلنے لگتی۔ جبڑا ڈھیلا ہو کر بجنے لگتا اور گال پر کے عضلات پھدکنے لگتے۔ رفیق کے نو ٹھاٹ تھے کہ بھئی اشوک کمار لگتا تھا۔ یہ آج کل لڑکیاں لوگوں کا سینما والوں سے کیوں مقابلہ کیا کرتی ہیں۔ فخرن کی ساری دوستیں ولیلا چٹنس کانن دیوی، رمولا اور رجنا سے ملتی جلتی بتائی جاتی ہیں اور ایسے ہی ان کے بھائی بند پرتھوی راج، سہگل اور شاہنواز سے ملتے ہیں۔ مگر گھر کے سارے لڑکے

نیولوں اور ریچھ ہوں سے ملتے جلتے ہیں ! ان باتوں پر سب کا خون کھول اٹھتا۔

منّو نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور پہلے ممانی کے پاس بیٹھا۔ ممانی کی ننّی بچّی نے جلد ہی اسے وہاں سے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ اماں بیٹھی لوبیے کی پھلیاں ناخونوں سے توڑ رہی تھیں۔ وہ ان کے پاس کے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ دور ممانی بچّی کو اوندھا کئے لوٹے کی دھار ڈال رہی تھیں۔

"اماں ....!" اس نے گلا صاف کیا۔

اُونہو... اے یہ کیا جل رہا ہے...... خی.... تھو" انہوں نے باورچی خانہ کی طرف تھوک کر کہا۔ جب کبھی منّو ان سے کوئی سنجیدہ نہایت ضروری بات کہنا چاہتا۔ وہ اسی طرح اُپلوں اور لہسن کا ذکر کرنے لگتیں۔ مگر وہ نہ مانا۔

"اماں.. ... وہ آپ نے ...."

"کیا بیٹے؟..... اے تم نے آج لسّی نہیں پی... بیٹی فخرن میرے ہاتھ پیاز کے ہیں۔ ذرا منّو کو لسّی تو بنا کر دو"۔ فخرن کے رونگٹے رفتگے نے صدائے احتجاج بلند کی اور وہ خونی نظروں سے منّو کو گھورنے لگی۔

"جی میں آج...."

"اٹھتی ہے کہ اب دوں ایک جوتی ...." ممانی نے سلیپر اٹھا کر پھینکی جو فخرن سے دس گز کے فاصلے پر گری ان عورتوں کے نشانے کتنے خراب ہوتے ہیں۔

فخرن دھما دھم پیر مارتی نعمت خانہ کے کواڑ جھنجھوڑنے لگی۔ لسّی بننے لگی مگر منّو کو معلوم ہو رہا تھا کہ بجائے دودھ شکر کے اس میں شاید چمچے رکابیاں ڈبے اور نعمت خانہ کے کواڑ کوٹ کر ڈالے جا رہے ہیں۔ خیر لسّی بن کر آئی اور منّو سمجھا اب منہ پر گلاس لگا۔ مگر خیر وہ گلاس چوکی پر پٹخ دیا گیا۔ اماں جاتی ہوئی فخرن کو دیکھنے لگیں۔ ایک دم سے انہیں کچھ خیال آیا

"اے بیٹی فخرن ..... ادھر آئیو ...... ذرا یہ چھلاّ دینا ... نہیں یہ انگوٹھی دے دو۔"

"تنگ ہے پھوپھی اماں ..... اترے گی نہیں ..." روٹھے ہوئے گال پھلا کر کہا۔

"لاؤ میں اتار دوں ..... اُونہہ ..... اُونہہ ..... دیکھو ذرا اڑ کے رہ گئی ..... پونچھو ذرا ..." اُنہوں نے منّو کی طرف اس کا موٹا سا ہاتھ بڑھایا۔ منّو کے ہاتھ سے لسّی کا گلاس پھسل کر بھاگنے لگا۔ وہ تو شکر کہ خود فخرن نے گال پھلا کر ناک سکیڑ کے جو زور لگایا۔ تو انگوٹھی اتر آئی۔

"میاں ..... یہ لو" فخرن کو جاتا دیکھ کر بڑے راز سے بولیں۔ "اس سے ذرا ڈھیلی رکھنا۔ ماشاءاللہ بڑھتا جسم ہے۔" اور منّو کو معلوم ہوا کہ جیسے انگوٹھی نہیں بلکہ بڑا سا گھیرا ہے۔ جیسے سرکس میں ہوتا ہے اور جس میں سے بندروں کو کدایا جاتا ہے۔

"اور یہ تین تنگ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کہنا جمعرات تک دے دے۔
"مگر اماں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ۔ ۔ ۔ ۔"

"خدا کی مار دلہن —— اے لونڈیا —— اے لونڈیا، لیجو منّو ——
اے منّو —— اے لونڈیا —— اے لونڈیا —— ! ممانی کی چھوٹی بچی اور ان
میں سے آدھی لگی ہوئی نٹ بازی کر رہی تھی۔ حقارت سے منّو نے اُسے
ایک طرف ڈالا۔

یہ صاحبزادی ہوائیں اچھلنے سے بڑی خوش ہوتی تھیں۔ ان کے ایک
بدمذاق چچا آتے ہی اسے ہوائیں اچھالا کرتے تھے اور اس کی وہ اس
قدر عادی ہو گئی تھی کہ بس جہاں چچا سے ملتا جلتا آدمی دیکھا اور پھیلا کر
دوڑیں۔

"اے لیلے منّو دیکھ تو کیسے مڑ مڑ دیکھ رہی ہے" منّو چڑ گیا۔
"لاحول ولا قوت!"

"اپنے دولہا بھائی کو دیکھ رہی ہیں۔ ۔ ۔ ۔" ممانی آ کر بولیں اور منّو کا
جسم بیٹھے بیٹھے دوڑنے لگا۔ بھاگا وہ وہاں سے۔

پست ہو کر وہ کمرے میں پڑ گیا۔ اور شام تک نہ نکلا، ویسے بھی فخرن
کی سہیلیاں آج چھائی ہوئی تھیں۔ صبح ہی جو وہ برآمدے میں سے گزرا تو
سوسنیوں کی طرح جلائیں۔

فخرن تمہارے دُولھا... " اور فخرن نے شرما کر گھونسے مارنے شروع کر دیئے۔ یہ عورت جب کہیں شرماتی تھی۔ تو بجائے جھکنے دبکنے کے ہمیشہ پہلوانی پر اتر آتی تھیں۔ اور بادل ناخواستہ جب انگوٹھی بن کر آگئی تو پھر اس نے گھر میں ہی جانا بند کر دیا۔ فخرن بھی اب پردہ کرنے لگی تھی۔ مگر یہ اس کا ہی کلیجہ جانتا تھا کہ وہ کیسا کچھ پردہ کرتی تھی۔ ویسے تو خوب سہیلیوں کے ساتھ مل کر اس نے زیست دشوار کر دیتی۔ مگر جہاں کوئی کام کرتی ہوتی اور وہ گیا۔ تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کو ٹھڑی میں بھاگ جاتی

" ہٹ جاؤ برآمدے میں سے، ہم پالی خالہ کے یہاں جا رہے ہیں" ایک دن حکم دینے لگیں۔ منو کھڑا برآمدے میں سر کھجا رہا تھا۔ اس کا جی جل گیا اور چاہا، چپّی اٹھا کر ایک چپت لگائے۔ وہ بے رخی سے کھڑا رہا ــــ کیا حکم چلاتیں ہیں۔

" ہٹ جاؤ نا... " ذرا لجاجت سے کہا گیا ــــ " اچھے ذرا دیر کو... "

" کھا جاؤں کا کیا میں تمہیں...... چلی کیوں نہیں جاتیں۔ "

" اوں! " چق میں سے کاجل لگی دو آنکھیں مچلیں۔ منو کے گھٹنے کمزور پڑ گئے اور اسے غصہ آنے لگا۔ جب کبھی وہ اس کی آواز سنتا تھا۔ تو اسی طرح اُسے کمزوری محسوس ہوتی تھی۔ اور اس کمزوری پہ آتا تھا غصہ۔ وہ برآمدے سے ہٹ گیا۔ اور وہ دوڑتی ہوئی پالی خالہ کے مکان میں گھس گئی۔ معلوم ہوتا

تھا. جیسے میل گاڑی منّو کے نازک سے سینے کو دلتی ہوئی گزر گئی. لڑکی تھی کرکٹ کی گیند کھٹاک سے ماتھے میں کوئی چیز لگتی تھی۔

اور پھر وہ نوکر ہوا تو اس کی اور بھی ہمت ٹوٹ گئی. جب بھی اس نے گفتگو کرنا چاہی، اماں کو لوبئے کی پھلیاں، مونگ کی دال اور بیسنی روٹی میں غرق پایا. کاش صرف ایک دفعہ وہ ممانی کی چھوٹی بچی کتے کی کونڈیلی اور جلتی ہوئی ہانڈی کو بھول کر اپنے اکلوتے ہونہار بیٹے کی طرف دیکھتیں، کیا وہ میتھی کے ساگ سے بھی گیا گزرا تھا. کیا اس کی حیثیت آلو کے ایک قتلے سے بھی زیادہ گری ہوئی تھی. کیا وہ ارد کی دال سے بھی زیادہ نیچا تھا کہ اسے دو لفظ نہیں کہنے دیئے جاتے تھے۔

اور پھر اس کی شادی ہونے لگی۔ آئے دن عجیب وغریب وضع کے کپڑے تاگے اور سوئیاں لانی پڑتیں۔

"اے وہ گریبان پر گجائی کم ہو گئی ــــــ میاں ذرا سوا ماشہ لیتے آنا.... عطردانی پر دھنک کم پڑ گئی ہے، ذرا گز بھر لے آنا... پلّو سچے کتنے تک کے ہوں گے، وہ زردوز موئے نے گوٹ پوری کی کہ نہیں..... اسے میاں یہ مونڈی کاٹے نے موٹا سلما لگا دیا. اور تم نے کچھ کہا بھی کہ نہیں...."

اب بتایئے وہ کیا تو گجائی کو جانے اور کیا موئے سلمے کو. ہاں دھنک بیشک وہ کئی مرتبہ فخرن کی گڑیوں کے لئے لا چکا تھا. مگر دھنک کے نام سے اس کے جسم میں شعلے بھڑکنے لگتے تھے. یہ عورتیں دھنک کیوں منگاتی ہیں۔

مگر وہ لاتا، سب کچھ لاتا۔ وہ بھی دیکھ رہا تھا۔ کہ کہاں تک اس کی اماں ظلم توڑتی ان کی جان پر، کبھی تو پچھتاوا آئے گا۔

اور اس کی حالت غیر تو اس دن ہوئی جب ایک دن اسے کیچڑ میں بھیگا ہوا ایک جوتہ بھیجا گیا کہ دلہن کے لئے کامدار جوتی لاؤ۔ جوتے کو دیکھ کر وہ لرز گیا۔ چوڑا ٹیڑھا بدنما۔ زمانہ قدیم کے شراب کے قرابے سے ملتا ہوا جوتہ، اور اس قدر بڑا۔ کیا اس کی بیوی کا اتنا بڑا اکڑن پچا کے برابر پیر تھا۔ اس کے خود کے جوتے اس کے سامنے نہایت نحیف و لاغر معلوم ہو رہے تھے۔ خود اس کے یہ جوتہ ڈھیلا ہوتا۔ خوف سے اس نے اپنے پیر کے انگوٹھے اکڑا لئے۔ اب بھلا وہ یہ جوتا ناپ کے لئے لیکر دوکاندار کو کیا۔ منہ دکھائے کہ صاحب ہماری دلہن کے لئے جوتا دے دو — اور ڈوب مرنے کا مقام ہے۔

اور پھر شادی میں ہر ایک نے اس کا دل دکھایا۔ فخرن عرف عام میں دلہن پکاری جانے لگی۔ اس سے بھی اس کا جی جلتا۔ اتنی جنگلی بد مذاق عورت کو دلہن بنانا کہاں کی انسانیت تھی۔ دلہن بنی دیکھ کر اسے پھر کمزوری سی آنے لگی اور خود سے اُسے نفرت ہو گئی۔ جی چاہا بید سے اسے خوب پیٹے اور حکم دے کہ چلو سیدھی طرح، یہ پڑیا بن کر کیوں بیٹھی ہو مگر وہاں تو با دل ناخواستہ شکر کی ڈلیاں کھلانی پڑیں، کھیریں چٹائی

پڑیں اور صدقہ واری ہونا پڑا۔

آرسی مصحف کے وقت اس کا قطعی دل نہ لگا۔ ہزار دفعہ دیکھ کر جس صورت سے جی متلا گیا ہو اسے کوئی کیا دیکھے۔ مگر وہ پیدا ہی مجبور بننے کے لئے ہوا تھا۔ منہ دیکھ کر وہ کچھ گھبرا سا گیا۔ فخرن! کتنی عجیب شکل تھی اس کی! کہ بے اختیار وہ کھسیانہ ہو کر رومال سے عینک پونچھنے لگا۔ اور گھنٹوں اس کے ہاتھ لرزتے رہے۔ جن میں دیر تک عطر اور مہندی کی بوستاتی رہی۔

تھوڑے دن تک تو وہ کچھ مبہوت سا رہا۔ حیران اور ششدر بیشک وہ بدقسمت تو ازل سے تھا ہی اور اب تو بالکل ہی بدتر حالت ہو گئی تھی یہ بات نہیں کہ فخرن اُسے کچھ اچھی لگنے لگی تھی۔ وہ اب بھی ویسی ہی پھولے ہوئے گالوں کی ضدی لاپرواہی کرنے والی لڑکی تھی۔ جب شادی ہوئی تو ایسے روئی گویا مر ہی تو جائے گی ایک ہی گھر میں ماں سے گلے مل کر ایسے روئی گویا سات سمندر پار بیاہ کر جا رہی ہے۔ اور دوسرے ہی دن سے ایسی خوش نظر آنے لگی جیسے کوئی ملک جیت لیا ہو۔ ماں کی طرف بھول کر بھی ہو جاتی۔ یہ نہیں کہ وہ کچھ منّو پر عاشق ہو گئی ہو بلکہ منّو سے زیادہ تو وہ اپنے چاندی کے پان دان، ٹکے ہوئے جوڑوں اور دست بند اور جھمکوں پر زیادہ فریفتہ تھی منّو چاہتا شروع سے اس کا زیادہ لاڈ نہ کرے اور بے رخی سے اُس کا دل دکھا کر کلیجہ چھلنی کر دے، مگر اسے بےرُخی کا موقعہ ہی کب ملتا؟ اس سے قبل

کہ وہ بے رخی دکھائے، وہ پڑ کر سو جاتی اور ذرا بھی جگاتا تو زور زور سے
اوں، اوں کرکے غل مچاتی۔ ذرا سا گھر پاس کے کمرے میں اماں سوتی تھیں!۔
ماں کے انتقال کے بعد وہ گھر پر طاعون کی طرح چھا گئی۔ ساری
تنخواہ کوڑی کوڑی کرکے گنوا لیتی۔ اور پھر خرچ پر وکیلوں جیسے سوالات
کرتی اور قابل اطمینان حساب دینے پر بھی وہ مشکوک نظروں سے دیکھتی۔
"خوب جانتی ہوں میں!" وہ ہوشیار بن کر کہتی۔
"مجھ سے گھر کا خرچ نہیں چلتا، ہاں نہیں تو..... ایسے روپیہ
پھونکوں گے تو کیا رہے گا ــــــ"
"کیا پھونکا ہے میں نے روپیہ....؟" حالانکہ وہ خود کماتا تھا۔
"کس نے کہا تھا کہ تم یہ بلاؤز کا کپڑا لاؤ ــــــ" یہ یعنی گویا یہ بلاؤز
بھی اب وہ خود پہنے گا۔
اسی منحوس کے لئے تو لایا اور پھر اوپر سے ٹکا سا طعنہ سننا پڑا۔
"صابن کی ٹکیاں تین تین پڑی ہیں، اور لے آئے۔ کس نے کہا تھا
تم سے؟"
"ارے بھئی ہر چیز مہنگی ہوتی جا رہی ہے، میں نے کہا لاؤ تھوڑا
زیادہ خرید لوں۔ کام ہی آئے گا ــــــ"
"ہوں کام ہی آئے گا" ــــــ وہ بڑبڑاتی۔ حد تھی زیادتی کی خود تو نہ

جانے کیا کیا الا بلا خریدتی۔ کچھ نہیں تو شیشے کی پیالیاں ہی خرید لیں۔ یہ بھی کیوں؟ "اے بھئی ہمیں پیاری لگتی ہیں"! اور نہیں تو کاغذ کے پھول خرید لئے یہ کیوں؟

"اے بالکل اصلی لگتے ہیں، تمہاری میز پر سجائیں گے!"

"یہ مٹی کی گائے کیوں خریدی۔؟"

"اے لو یہ اتنی اچھی لگتی ہے جیسے سنگ مرمر کی!"

"اور یہ دلیوے کیوں منگائے گئے ہیں ——"

"ہی . . . ہی ہی ہی . . . . . تمہیں کیا . . . . ہم دیوالی پر جائیں گے . . . ہی ہی . . . " یہ لیجئے!

"بہت روپیہ ناس کرتی ہو —— شنو جی! تم نہیں تھیں تو سو روپیہ بچتے تھے —— اور ——"

"سو نہیں ہزار بچتے تھے۔ پھوپھی اماں تھیں تو میرے کتنے جوڑے بنا کرتے تھے —— اور اب . . . ."

"اجی اب کون سے کم بنواتی ہو ——" ماں کی تعریف ہمیشہ اُسے کمزور بنا دیتی تھی۔

"خاک بنائی ہوں اپنا کفن!" کفن کے ذکر پر اسے ہمیشہ ایک ہولناک واقعہ یاد آجاتا، جب اس نے باریک عمدہ ململ کے کُرتے بنانے کا ارادہ ظاہر کیا تو پہلے تو وہ اس بات کو ہی ٹالتی رہی اور پھر جو ایک دن کپڑا دیکھا

تو ٹال مٹول کے بعد کتنے کے کفن جیسی ململ پسند کی۔

"اے دھل کے ایسے نکلے گی کہ کیا بتایا جائے ـــــ وہ خاموش مُرغ بیٹھا رہا تو شرمندہ ہو کر آخر اس نے سترہ روپے گیارہ آنے کا تھان خرید لیا۔ یہ تھان وہ جب کبھی خرچ کا ذکر ہوتا یا روپیہ کی تنگی ہوتی وہ ضرور حساب میں لگا لیتی اور اس سے قبل کہ وہ اسے طعنے دینے کے لئے مواد جمع کرے وہ بڑھ وسن سے بکواس کرنے، ماما سے لڑنے یا صندوق کریدنے چل دیتی۔ یا بس "ہی ہی" شروع کر دیتی اور اس کے پیروں میں گدگدیاں شروع کر دیتی

"دیکھو جی تم بات ٹال جاتی ہو۔"

"تو کیا ہے؛ ہائے اللہ میں تو مر جاؤں ـــــ لے کے کھاتے جاتے ہیں۔ دن رات کا گودنا یہ کیوں کیا، وہ کیوں کیا ـــــ ہائے کمر میں درد ویسے ہی اٹھ رہا ہے۔" وہ فوراً بیمار ہو جاتی۔

"قسمت پھوڑ دی گئی . . . . . اور پھر کھوں بھی نہیں۔"

"تو کیا کروں میں . . . . سدا ہی سے مجھ سے تو جلتے تھے تم جل ککڑ کہیں کے ـــــ وہ تو میری پھوپھی اماں ہی مجھے چاہتی تھیں ـــــ اماں سے بھی زیادہ پیار کرتی تھیں۔"

ماں کے ذکر سے منّو کا دل ہچکولے کھانے لگتا اور پھر اکھاڑے جم جم

کر لڑائی ہوتی، ایک دن تھوڑی، ساری عمر کا معاملہ تھا۔ بات بات پر لڑنا روٹھنا، بھوکی سو جانا، کھانا نہ کھانا، یہ نہیں کہ اس کے ایک دن کے نہ کھانے سے کچھ دبلی ہو جاتی تھی۔ وہ تو دس برس نہ کھاتی تو کافی چربی اور گوشت موجود تھا۔ وہ خدا سے چاہتا تھا۔ کہ ذرا دبلی ہو جائے کہ کچھ تو اس کی بیوی جیسی معلوم ہو کیا بوڑ تھا۔ بھلا لوگ کیا کہتے ہوں گے کہ بھلا یہ بھی میاں بیوی ہیں۔ دنیا جہان کی بیویاں نازک پھول جیسی ہوتی ہیں۔ یہ نہیں کہ چلیں تو معلوم ہو سڑک کٹ رہی ہے۔ پلنگ پر کروٹ لیں تو پڑوس تک چرچراہٹ سنیں اور وہ اتنا نازک ـــــ بالکل شاعروں جیسی پتلی گردن اور دبلے ہلکے بازو۔ کہیں دور اس کے دل کی گہرائیوں میں یہ آرزو چھپی ہوئی تھی کہ ـــــ کہ وہ بھی کسی پھول جیسی ہلکی پھلکی تیتری کو یوں بازوؤں میں اٹھا لے جیسے . . . . مگر وہ اس آرزو کو دماغ سے آگے نہیں بڑھنے دیتا تھا۔

. . . .

ایک بات سے اُسے سخت ہتک محسوس ہوتی تھی، وہ فخرن بی نے اس کے چال چلن کے متعلق عجیب و غریب نظریہ قائم کر لی تھا۔ نہ جانے وہ کیوں اسے بدمعاشی آوارگی کے ناقابل سمجھتی تھی۔ گو وہ کبھی بدراہ تو نہ ہوا۔ لیکن پھر بھی اکثر کلب یا لیکچر وغیرہ میں بہت رات ہو جاتی۔ مگر ایک دن جو اس نے بھولے مُنہ سے دو حرف الزام کے لگائے ہوں اور کہتی

بھی تو یہی کہتی۔

"نہ جانے کن کن لوگوں میں مارے مارے پھرتے ہو۔۔۔" گویا وہ صرف لوگوں ہی میں پھرتا تھا۔ عورتیں تو اس نے دیکھی ہی نہ تھیں۔ آخر اس میں رقابت کا ذرہ بھر بھی مادہ نہیں تھا۔ یہ اس کی ہتک تھی، دنیا بھر کی عورتیں جلا کر کرتی ہیں۔ اور عموماً ہر ایک میاں کی جیب میں ایک رقیب مثل پولیس مین کے ڈنڈے کے چھپا رہتا ہے۔ جسے موقع بہ موقع بیوی کی چاند پہ مار کر مزا لیا جا سکتا ہے۔ بہت سے میاں تو صرف تخیلی رقیب بیوی کے لئے تیار رکھتے ہیں۔ بیوقوف فخرالنّسا ناک چڑھا کر کہہ دیتی ہے۔

"اے چلو، بس معلوم ہے۔ ایسے ہی بُتِ طنّاز تھے تو شادی سے پہلے نہ کر لیا کسی سے کچھ، اے تم ہمیشہ کے "سیدھے" ہو۔ کسی طوائف کے یہاں تو جانا بھی مت، بڑی چٹاخ پٹاخ ہوتی ہیں یہ، بغلیں جھانکنے لگو گے۔

اور جو ذرا عقلمند ہوتی ہیں۔ وہ آنکھوں میں آنسو لا کر بسور دیتی ہیں اور میاں باغ باغ!

دن پہاڑ سے گزرنے لگے۔ عمر چلتی چلی گئی۔ فخرن اور منو کبھی ان کے دل نہ ملے۔ اب بھی بڑھاپے میں منو کو سینکڑوں کیڑے اس میں نظر آتے۔ وہ اب بھی ویسے ہی تابڑ توڑ لڑتی۔ جوان جوان بیٹے داماد اس پر مسکراتے، بہوئیں بیٹیاں ہنستیں!

"کتنا کہتا ہوں کہ مرچیں نہ کھایا کرو، خونی پیچش ہے!"

"تمہاری بلا سے مرنے دو۔۔۔!" وہ اسی طنطنہ سے جواب دیتی۔

"یہ مصنوعی دانت ہیں ہڈی توڑنے سے چٹخ جائیں گے ــــ ایسی ہڈیاں کتوں کی طرح چابنے کی بڑھاپے میں کیا ضرورت ہے۔"

تم اپنی کہو بڈھے ہو گئے مگر جوان بچوں کے سامنے لڑنا نہ گیا ــــ اے ہاں نہیں تو جان کو آگئے ہیں میری!

"سٹرِیا گئے ہیں بیٹی تمہارے نانا ابا . . . . . سدا کے جھکی ہیں" وہ اپنی نواسی سے کہتی۔

"یہ تمہاری دادی اماں بس ہمیشہ کی تتیا مرچ ہیں۔ کیا بتاؤں بٹیا مجھے تو کبھی پھوٹی آنکھ نہ بھائیں . . . . . شروع سے نفرت تھی" وہ اپنے پوتے سے کہتا۔

"ہاں میں ہی تو گئی تھی۔ تمہاری دہلیز پہ کہ لو کر لو مجھے ــــ سو دفعہ ناک رگڑی تھی۔ تھے تم کس قابل ہمیشہ کے بھٹکنے رو گی" ــــ وہ بدمزاجی سے پاندان کی چٹخنی ہلاتی اور سروتہ تلوار کی طرح گھماتی، اُس کا دل بیٹھنے لگتا پوتے پوتیاں ہنسی دباتے کمروں میں بھاگ جاتے۔

"میں کہتا ہوں تمہیں کچھ شرم حیا بھی ہے یا نہیں ــــ یہ جالی کا کرتہ اور ساری . . . ."

"چلو تم تو بڑے شرمیلے ہو . . . . . کل تہبند باندھے دھوپ کے رخ کھڑے تھے . . . . . سچ کہنا رحمانی بوا میرا دھنو ٹوٹ گیا تھا۔ کہ نہیں ــــ" وہ جلدی سے دوپٹہ سنبھال لیتی۔

"اے بی کیوں کیوں منہ کھلواتی ہو . . . . . پیڑھی کھڑی کر کے نہانے بیٹھ

گئیں۔ سمجھتی ہو کہ ماشاءاللہ تمہارا ساڈیل ڈول پیڑ ھیوں سے چھپتا ہے!

"اے مردو نے دماغ خراب ہوا ہے کچھ.... پیڑھی تھی کہ پیر دتی بیگم کی کھٹولی ——" وہ غصّہ سے آپے سے باہر ہو جاتی۔

"وہ کھٹولی ہی سہی مگر خدا کی بندی.....!" اور گھنٹوں چخ چخ ہوتی، یہاں تک کہ وہ اپنا پرانا داؤ چلاتی اور فوراً بھینس کی سانی۔ ککڑی کے رائتہ اور سل کی کھٹائی پر نوکروں چاکروں سے تو تو میں میں کرنے لگتی، بیچ بیچ میں شگوفے چھوٹتے۔

"یہ ہے مہذب عورتوں کی زبان.... کہو بھلا آفتاب بچارا نوکر ہوا تو کیا، ہے تو سیّد! اور اسے یہ حرامی پلّہ کہہ رہی ہیں —— شریف خاندان کی عورت اور یہ ——"

مگر اسے مجبور ہو کر باہر چلا جانا پڑتا۔ وہ اداس ہو کر اخبار میں معمّہ حل کرنے لگتا۔ دس سال سے وہ اسی فکر میں تھا۔ کہ ایک معمّہ کا حل ٹھیک ہو جائے اور بیس ہزار کا انعام لے کر دور کہیں خوابوں کی حسین وادی میں اپنی نئی زندگی کا آغاز کرے!

پھر وہ نئی زندگی جس کا آئے دن کی بیماریوں اور بد ہضمی نے اُسے اور بھی منتظر بنا دیا تھا۔ شروع ہو گئی۔ آخری معمّہ نکلنے سے پہلے ہی پرانی دستوں کی بیماری عود کر آئی۔ سارے غم سارے صدمے میلے کپڑوں کی طرح اُتر پڑے اور ہلکے پھلکے چھے کی طرح وہ ہوا کی لہروں پر پھد کنے لگا۔ جنت! آخر تو اس کی ریاضت اور صبر کا اجر مل گیا۔ اس نے اپنے غیر مرئی ہاتھ ہوا میں اچھالے

اور پھر انہیں اپنی پسلیوں پر رکھ کر نیچے پھسلایا ـــــ سب آسان، ذرا بھی تو کھردراپن نہیں۔ اس کا سر غبارے کی طرح ہلکا ہو گیا اور پیر سائیکل کے پہیوں کی طرح تیز!

اوہ! وہ ٹھٹک گیا! لاحول ولا قوۃ! فیشن ایبل لڑکیوں سے اسے ہمیشہ چڑ تھی۔ کھلی باہوں کے جمپر، ساری بغلیں دکھائی دیں اور نیچا گلا ـــــ وہ اپنی نواسیوں پوتیوں سے اسی لئے تنگ تھا۔ کہ وہ آدھی آستین پہنا کرتی تھیں اور یہاں تو پانی کی لہر جیسے ساتے کے سوا کوئی چیز ہی جسم پر نہ تھی۔

"لاحول ولا قوۃ" وہ جنگی شکل بنا کر لعنت و پھٹکار کے پلندے لئے بڑھا ـــــ مگر ـــــ

"اے میں تو پہلے ہی جانتی تھی ـــــ" جانی پوجھی آواز آئی، وہ ٹھٹک گیا۔ اور کانوں کے سوراخوں کو ہلا کر جھاڑنے لگا ـــــ شاید دنیا سے کوئی مکر وہ آواز پڑی چلی آتی، ایک قدم بڑھا۔

خوب کر د غنڈئیاں ـــــ تا کا جھانکی! شک یقین سے بدلنا شروع ہوا۔

"اوفوہ ـــــ تو تم یہاں بھی ـــــ" وہ مجروح ہو کر مڑا۔

کیوں؟ میرا آنا ایسا کھلا اور وہ جو تمہاری لاڈو کھڑی تھیں تو کچھ نہیں۔"

کون؟ میری کون؟"

"وہی خمپارہ جسے تکا جا رہا تھا۔ میں کہتی ہوں بوڑھے ہو گئے، آئے دن کے روگی، دست گھڑی بھر کو نہیں رکتے مگر آوارگیاں کروائے کوئی تم سے ـــــ اے شرم بھی نہیں آتی تمہیں، نگوڑی پوتی کے برابر ـــــ حرامزادیاں

ہر ایک سے دیدے لڑاتی پھرتی ہیں!" ــــ وہ جاتی ہوئی جورُ کے اٹھلاتے ہوئے قد کو نفرت سے گھورتی ہوئی بولی۔

"اے ــــ ہے! میں کہتا ہوں میں ادھر دیکھ رہا تھا ــــ اور تم۔

"اے میری جوتی سے، تم جدھر چاہو دیکھو ــــ مگر میں کہتی ہوں کون سے تم نے ثواب کئے تھے۔ جو تم بھی ــــ کیا نام یہاں آگئے ــــ"

"اور تم نے کون سے حج کئے تھے جو مجھے کہہ رہی ہو۔ اللہ کی بندی بھول کر بھی سجدہ نہ کیا کبھی!"

"لو تم نے مجھے کبھی روزے نماز کا رکھا بھی۔ آئے دن کے چونچلے آئے دن نگوڑے بچے ــــ"

"تو اب اپنے گناہ بھی میرے اعمال میں لکھا دو ــــ"

"حج کو تو ہزار بار کہا۔ تم نے کبھی سُنا ــــ ایمان سے کہدو۔"

وہ حسب معمول لاجواب ہکلا کر رہ گیا۔

"مگر میں کہتی ہوں کیا اب یوں ننگ ملنگ پھرا جائے گا ــــ ذرا دیکھو تو شرم بھی تو اڑ گئی تمہاری، پتہ سارا اچھتی ہو رہا ہے!" وہ گھبرایا اور کیڑے لگے ہوئے انجیر کے پتے کو ٹٹولنے لگا۔

"اے وہ موٹی کمر بیب کی اوڑھنی میں نے تو ساری حرامی پلے منہ پر۔"

"الٰہی! چپ چپ ــــ اے خدا کے قہر سے تو ڈرو ــــ یہ جنت ــــ"

"ہوش کی لے مردوے، دوزخ ہو کہ جنت، بندی میں سے تو ان سنڈوں کے سامنے ننگا نہیں ناچا جاتا ــــ کان کھول کے سُن لو ــــ"

اُوہ ــــ یا خدا ــــ کیوں جی ــــ اے ــــ سفید عمامے والے۔
اے میاں ۔"

وہ ایک مقدس شکل دیکھ کر چلایا ــــ کوئی جنت کے اسٹاف میں سے تھا۔

"ارے بھئی ــــ وہ یہاں ــــ میرا مطلب ہے، کتنی دیر ٹھہرنا ہوگا"۔

"یہ آخری مقام ہے ــــ بہشت بریں ــــ"

نڈھال ہو کر اس کا جسم آگے پیچھے جھکنے لگا ــــ اور ــــ

"یہ موئے پتے کیا مجال جو گھڑی بھر کو رک جائیں ــــ"

اس نے جلدی سے کانوں انگوٹھے ٹھونس لئے ! ــــ

چال

"عطن، صفیہ ـــــ اے کہاں مر گئیں؟"

"ای۔ای۔ی" عطن کی جی سُنائی دی۔

"آئی بی!" صفیہ چیخی اور دونوں لڑکیاں برآمدے کے انتہائی کونے والے اندھیرے کمرے سے بیلوں کی طرح نکلیں۔ عطن کا کُرتہ کیلی میں اُلجھ کر چھر سے بولا اور صفیہ کی جوتی دہلیز میں پھنسی اور وہ گھٹنوں کے بل اگالدان کے پاس گر پڑی۔ اگالدان کئی دن کا بھرا بیٹھا تھا۔ پھیل پڑا اور صفیہ کے گھٹنے چھالیہ ملی ہوئی گاڑھی گاڑھی پیک میں لتھڑ گئے۔

"مٹو نہ تم! دیکھ کے بھوڑی چلیں ہیں۔ لاڈ کے دیدوں میں پانی اتر آیا ہے۔۔۔۔ آج اتوار کے دن بھی مری پڑی ہیں:"

"یہ دوپٹہ تو دیکھو ـــــ کیا مجال جو پٹو ڈالیں ـــــ جالو نہنیاں دھری ہیں اب تک ـ"

صفیہ فرش پر بیک ٹپکاتی غسل خانہ کی طرف چلی اور عطن نے دوپٹہ دوہرا ڈال کر کندھے ذرا ڈھلکائے اور سینہ اندر کو دھنسا لیا۔

"میں کہتی ہوں قرآن پڑھا؟"

"جی" ـــــ عطن کلبلائی۔

"اے قرآن پڑھا آج صبح؟"

"اوں ـــــ صفیہ ـــــ آں ـــــ" عطن اُنگلیاں مروڑنے لگی۔

"صفیہ کا نہیں میں تو تمہارا پوچھتی ہوں ـــــ عشاء کی نماز بھی ہضم کر گئیں کیا ملانی ماں نے جگایا۔ مگر جالو سانپ سونگھ گیا۔"

"انہوں نے تو ـــــ" اور عطن کا جی چاہا چوکی کے نیچے گھس جائے خالہ بی نے اسے سر سے پیر تک گھورا ـــــ معنی خیز ٹھوکا لگایا۔ کچھ بی کے کان میں گھس لپسائیں۔ سر ہلائے سر دتے گھمائے اور دونوں کسی معقول نتیجہ پر پہونچیں۔

"چلو دور ہو یہاں سے" ـــــ پھر خالہ بی سے "اے ہاں تو مجھے کیا معلوم ـــــ ذرا ذرا سی بچیاں ـــــ نگوڑی"

عطن کندھے ڈھلائے ترچھے ترچھے پیر مارتی اسباب والے کمرے میں

چلی گئی۔ دوپہر کو دونوں گھنٹہ بھر سر جوڑے ادھوری ادھوری باتیں کرتی رہیں۔ پھر پرانے پاجامہ کے دو عجیب و غریب تراش کے شلوکے اسی چوہوں کی بو آتے ہوئے اندھیرے کمرے میں بیٹھ کر تیار کئے۔ جنہیں پھنسا کر ان کی سانسیں گھٹنے لگیں۔ مگر نتیجہ اطمینان بخش رہا۔ جیسے سڑک کوٹنے کا انجن چل گیا۔ ہائے بھیا کے کتنے مزے تھے۔ مزے سے کرتہ اتارے پائنچے

چڑھائے گھوما کرتے تھے۔ اور یہاں ان کی پیٹھوں میں مہین مہین گرمی دانے ہو گئے تھے۔ جو سوئیوں کی طرح چبھا کرتے تھے۔

عطن کا دل چاہتا کاش وہ مر جائے اور یہی بچاری صفیہ کا دل چاہتا دونوں اندھیرے کمرے میں دردناک کہانیاں پڑھتیں۔ دونوں کے دل بھر آتے اور ایک دوسرے سے چمٹ جاتیں۔

"بجو میرا تو کلیجہ پھٹا جاتا ہے"۔

"سون" عطن سسکی لیتی "آہ وہ دردناک کہانیوں کی خوش نصیب ہیروئین جو مر گئیں۔ کاش وہ دونوں بھی اسی طرح مر سکتیں۔ تب بی اور خالہ اور ملانی چیخیں مار مار کر روتیں"! ہائے میں اپنی عطن کا سہرہ بھی نہ دیکھنے پائی — ہائے میں اپنی صفیہ کو دلہن بھی تو نہ بنا پائی —" اور دلہن بننے سے پہلے ہی اللہ کی پیاریاں ہو جانے کے خیال ہی سے ان کی آنکھیں امڈ آتیں گلے بھر جاتے محلہ میں بھوری کی کنواری بیٹی مر گئی تو اس کا جنازہ کیا خوبصورت سجایا گیا تھا

سرہانے کے پایوں سے لمبا سا مہکتا ہوا سہرا باندھا گیا۔ سرخ گوٹے کی اوڑھنی جسے زندگی میں وہ چھونے کو ترستی رہی اس پر ڈالی گئی۔ اور بھوری جو اٹھتے بیٹھتے اسے کوسا کرتی تھی۔ اس پر جان دینے لگی "بجائے "مرنے جوگنی" پیاروں پٹی" "گھاٹ کٹی" کے وہ اُسے "میری لاڈو" "میری بنو" "میری شہزادی کہنے لگی تھیں کہ عطن صفیہ مر جائیں تو بی اسی طرح جھنگاڑ بن گی۔ خالہ بی سر بھوڑیں گی۔ ملانی ماں بال نوچیں گی اور ملانی ماں کے بال نوچنے کے خیال سے ان کی باچھیں کھل جاتیں۔ وہ کیسے کیسے ان کے جھوٹے نوچا کرتی تھیں۔ کتنی خوش ہوتی۔ جب تخیل کی نظروں سے وہ ان سب کو اپنے کفنوں میں لپٹنے کو تیار قبروں کودتے، دھمکیاں دیتے محسوس کرتیں پھر خود ان کا دل بھر آتا گلے سوجنے لگتے، سینے پھول جاتے اور وہ عجیب و غریب تراش کے شلو کے ان کا دم گھٹنے لگے۔

اور اتوار کو غسل ہوتا۔ جو غسلِ میت سے کم نہ ہوتا۔ پھر بادیہ کھلی کوٹ کر بھگو دی جاتی۔ مرچوں دار السی کی کھلی۔ اس سے جوئیں مر جاتی ہیں جب مرغیوں کے رُچیں پڑ جاتی ہیں تو مٹی تیل لگاتے ہیں۔ جس سے ان کی کھال تو اُدھڑ جاتی ہے۔ پر جوئیں مر جاتی ہیں۔ یہ کھلی مٹی کے تیل کا کام دیتی تھی۔ جب خوب پھول جاتی تو کھلی کے لوتھڑے ملانی اماں ان کی کھوپڑیوں پر تھوپ کر گھسّے مارتیں اور اس غضب کے پہلوانی ہاتھ دکھاتیں کہ غریب عطن صفیہ کی گردنیں زمین سے لگ لگ جاتیں، کوٹھے ہوا میں اٹھ جاتے اور پیڑھیاں

الٹی ہو جاتیں ___ اور ___

" اے ہے بوا ڈھئی پڑتی ہو ___ گردن میں ست نہیں " ___ ملانی ماں ___ غرائیں اور ان کے آنسو کھلی کی جھان میں مل کر ان کی آنکھیں پھوڑنے لگتے ۔ ناک جل اٹھتی۔ کنپٹیاں پھٹنے لگتیں۔ یہ بال پیدا کرنے میں اور وہ بھی ملانی ماں کی پہلوانی کو دیکھتے ہوئے اللہ میاں نے کیا مصلحت سمجھی۔ گنجوں کو نہ تیل کی فکر نہ کنگھی کا ٹم نہ روز روز کھلی کے گھسے! ایک دفعہ عظمیٰ کو جب موتی جھرہ ہوا تھا۔ تو سارے بال اترا دیئے گئے تھے۔ کس مزے سے ہلکی ہلکی گھوما کرتی تھی۔ مگر ایک اور مصیبت تھی کہ ٹیکہ جھومر بھی ہاتھ سے جاتا تھا۔ صفیہ اور آپا کیا مزے سے طباق جیسے منہ پر ٹیکے لگا کر جائیں۔ اور وہ سر منڈھے بیٹھی رہی ___

" چار لوٹے دائیں شانے پر اور چار لوٹے بائیں پر " ___ ملانی ماں پاک ہونے کے اصول بتائیں۔ اب اگر جاڑے ہوتے تھے۔ تو کیسے چار لوٹے چار چلّو ڈالنا دشوار ہو جاتے اور جو گرمیاں ہوتیں تو مزے سے نل کے نیچے بیٹھ گئیں اور تڑاتڑ پانی پڑ رہا ہے۔ ٹھنڈے ٹھنڈے پانی کی سلاخیں جسم کی نسکنوں پر پھسل رہی ہیں۔ پانی قل قل کرتا نالوں پر کودتا نشالوں پر پھسلتا موری میں جا گرتا ___ جیسے کوئی شراب انڈیل رہا ہو ___ نیند سی آنے لگتی لگتی اور ویسے بھی غسل خانہ کی فضا میں سوراج مل جاتا، آزادی! پر پرزوں سے آزاد ___ مزے سے چوکی پر سے نل کی پٹڑی پر وہاں سے میلے کپڑوں

کے پاس پھر صابن لینے یا بیسن اتارنے الماری کے بالائی حصّہ پر آزادی سے پھدکا کرتیں۔ بیکار ہی وہ قلانچیں بھرتیں ـــــ ہوا جسم پر لپٹ جاتی۔ ہاتھ پیر ہلکے ہو جاتے۔ صابن ملتیں چکنے چکنے ہاتھ ایسے پھسلتے کیا بتائے جیسے کسی نے ریشمی کپڑوں میں لپیٹ دیا۔ بیسن ملتیں ہلکی ہلکی میٹھی میٹھی سوزش دردرے دال کے دانے سوندھی خوشبو، جی چاہتا ہولے ہولے انگلیاں پھیرے جائیں جی چاہتا کوئی کانٹوں دار چیز کی رگڑ اس مسلسل گدگدی کو مٹا دے۔"

"اے ابھی تک میت نہا نہیں چکی" کی صدا انہیں جگا دیتی اور وہ نل کی دھار کو آخری مرتبہ بازوؤں میں بھینچنے کی کوشش کرتی اور تھکی ہوئی آنکھوں سے ان عجیب و غریب تراش کے شلوکوں کو دیکھتیں جو سڑک کوٹنے

کے انجن کا کام کرتے تھے۔ اور تعداد میں کم ہونے کی وجہ سے پسینے سے گل چکے تھے۔ اور ان میں مرگھٹ جیسی چرانڈ آنے لگی تھی۔ اتنا سلیقہ کہاں تھا کر رات کو چپکے سے دھو کر پھیلا دیتیں اور صبح ہی صبح اٹھا لیتیں۔ ایک دن کمبخت بھیّا کے ہاتھ پڑ گیا۔ تو نہ جانے کیوں انہوں نے سب کے سامنے جاکر دکھانا شروع کیا۔ کوئی بھی تو نہ پہچانا کہ وہ کس قسم کا ہتیار ہے آخر میں بھیّا نے فیصلہ کیا کہ منوا کا جانگیہ ہے جسے وہ گندی دوائیوں کے لئے استعمال کرتا ہے۔

"صاحب اگر میرا ہوئے تو بدن میں کیڑے ہی پڑیں ـــــ دین محمد کا ہوئیگا" ـــــ اور دین محمد صاف مکر گیا اور اس کے مالک کو موٹی موٹی گالیوں والی بیماریاں لگانے لگا ـــــ

عطن، صفیہ سر جھکائے کلام اللہ کی تلاوت کرتی رہیں۔ کبھی کبھی ان کی آنکھیں ایک دوسرے سے ٹکرا جاتیں اور لب ہلنے لگتے۔ اور اس کے بعد سے یہ دستور ہو گیا تھا۔ کہ جب وہ بھیانک شلوکے گل جاتے اور پرانے کاغذ کی طرح بکھرتے لگتے اور میل کی پپڑیاں پھٹنے لگتیں۔ اور جس مقصد کے لئے وہ بنائے جاتے تھے۔ وہ غبط ہو جاتا۔ تو وہ ان کی گولی بنا کر سنڈاس میں ڈال آتیں اور اوپر سے پھر کر پھارا کھ۔

عطن، صفیہ جڑواں تو نہیں پیدا ہوئی تھیں مگر فضا نے انہیں توام رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ دنیا میں وہی ایک دوسرے کی ہمدرد جیون ساتھی اور سہارا تھیں۔ جب عطن کی کمر میں درد ہوتا۔ اور وہ کٹی مرغی کی طرح لوٹتی تو صفیہ گرم پانی کی بوتل لاتی۔ دیر تک ساتھ بیٹھی کمر مسلا کرتی اور جب صفیہ

کی پنڈلیاں پھٹتیں تو عطن ہی دوپٹہ کی پٹیاں کس کر تشنج کو روکتی اور زندگی کی سڑک پر ایک دوسرے کا سہارا بنی چلی جاتیں۔

مگر اسکول میں سہارے بٹ جاتے چونکہ الگ الگ کلاس میں تھیں۔ لہٰذا قانون کے مطابق عطن کو مس چرن پر مرنا پڑتا اور صفیہ کو مس حیدر پر۔ مگر پھر بھی صفیہ بھول کر مس چرن کی پھٹارہ سانپ جیسی سیاہ رنگت اور اینٹھی ہوئی ناک پر آواز نہ کستی اور نہ ہی کبھی عطن نے ہی کسی کو مس حیدر کے مصنوعی جوڑے اور آنگی ساری کا طعنہ دیا۔ وہ مل جل کر ایک دوسرے کی دوست بھی تھیں اور بہنیں بھی۔ بھیا کبھی کبھی ان بھگتی ہوئی استانیوں کو دیکھ کر

آتے تو بس اندھیر مچا دیتے۔ ایک دفعہ بڑی مشکل سے انہوں نے بھیک سے کیمرہ لیا اور فلم ڈلوا کر مس چیرن اور مس حیدر کی آڑھی ترچھی دھندلی تصویریں کھینچ ڈالیں۔ جب بھیا فلم دھلوا کر لائے تو انہوں نے سب کے سامنے ان کی شکلوں کا مذاق اڑایا۔ کہ عظمیٰ صفیہ کا پھر سے دردناک کہانیوں کی ہیروئن کی طرح مر جانے کو جی چاہا تاکہ بھیا کو کچھ تو رنج پہنچے۔ وہ سر پھوڑیں اور اطمینان سے ان کی لاشیں مسکراتی رہیں۔

یہی نہیں اور لاکھوں دکھ ان کی جان کو لگے تھے۔ زندگی ایک جال کی طرح الجھی ہوئی تھی۔ جس کا تانا خالہ بی تھیں۔ اور بانا ملائی ماں۔ قدم قدم پر پھندے ہر سانس پر گانٹھیں۔ ارے اور تو اور یہ انور بھائی، رشید بھائی، قطب بھیا اور نہ جانے کتنے "بھائی" آتے مگر سب کے سب آپاؤں اور باجیوں کو تاکتے آتے!

"عظمیٰ —— بنو ذرا یہ سروری کو تو دے آؤ —— لپک کے ——"

"صفو بیٹا پھر ہم تمہیں بڑی اچھی چیز لادیں گے —— ذرا یہ کپڑے کو دے آؤ —— ہاں چھپا کر دینا۔ خالہ بی نہ دیکھیں سمجھیں؟"

"کیا چیز لادیں گے آپ؟" وہ پوچھتیں۔

"اب جو کچھ بھی تم کہو۔ گڑیا، تکیہ کے غلاف کی جالی —— لپک کے جاؤ۔"

اور وہ لپک کر جاتیں۔ آئے دن بنڈل اور لفافے خالہ بی وغیرہ سے چھپا کر دشمن کے خیمے تک لے جاتیں —— اور ان کا جی جلتا، جان سلگتی —— جیسے

دیکھو گڑیاں دیئے جاتا ہے،

"نفرت ہے مجھے تو کلموہیوں سے ــــ میں تو سب نیبو کو دیدوں گی "

ــــ عطن ناک بھڑ کائی جیسے بس انہیں گڑیوں ہی کی تو ضرورت تھی! آخر یہ "بھائی اپنی بھتیجیوں کو گڑیاں کیوں نہیں دیتے۔ پر وہ تو نام کو تھا۔ گھنٹوں کو بھٹوں پر چھپ کر باتیں ہوتی تھیں۔ کاش کوئی ان کا بھی ہوتا۔ کاش زینوں اور گیلریوں میں پریشان کرتا۔ ان کے لئے بھی بنڈل اور لفافے آتے جنہیں لے کر وہ بھی منہ لال شرمائی ہوئی پلنگوں پر اوندھی پڑ جایا کرتیں ــــ مگر کہاں ان کی قسمت میں تو کوئلوں کی دلالی لکھی تھی۔ اِدھر سے اُدھر قاصد بنے پھرنا۔

مگر بدحال تو وہ اس دن ہوئیں۔ جس دن انہوں نے امانت میں خیانت کی اور ایک بنڈل کھول ڈالا۔ کچھ دیر تو وہ الٹ پلٹ کر دیکھتی رہیں۔ خاک نہ سمجھیں۔ ریشم اور نازک ناک فیتوں کا الجھا ہوا جال سا انہیں گلابی جالی دار مغزی باریک ربڑ کی ریشمی ڈوریاں! اُوہ! جلدی سے انہوں نے شرما کر پرانے کپڑوں کی الماری میں چھپا دیا اور لپک کر باہر نکل آئیں ــــ دل دھک دھک کرنے لگے۔ سانسیں پھول گئیں۔ اور باہر آ کر وہ گیہوں چھنوانے لگیں۔ گویا بڑے کام کی بیٹیاں ہیں۔

مگر دلوں میں کھدبد ہنڈیا پکتی رہی۔ سرجھکائے گیہوں انگلیوں کے سروں سے بکھیرتی رہیں مگر آنکھوں کے سامنے گلابی ریشم کے جال بنتے بکھرتے

رہے۔ وہ معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھتیں اور مسکرا پڑتیں۔ ننھا سا معصوم راز ان کے سینوں میں بھٹی کی طرح دہک رہا تھا جس کی سوزش سے چہرے تمتماتے جاتے تھے۔ گویا وہ پتوں یا پریوں کی دنیا سے کچھ اڑا لائی ہیں۔ اور کسی کو بھی نہیں معلوم کہ ان پرانے گوڈر کے لچھوں میں کیسا لال چھپا ہوا ہے۔ کھانے کے بعد وہ الماری کے قریب سے گزریں اور ایک دم سے عظمیٰ کو بڑی زور سے ہنسی آئی ـــــ اور صفیہ کو بھی اور دونوں بیتاب ہو کر اندھیرے کمرے کی طرف بھاگیں۔

"غضب خدا کا کیا ہی ہی لگا رکھی ہے۔ جوان جان لڑکیاں بڑی گھوڑیوں کی طرح اچھل رہی ہیں۔" ملانی ماں بڑبڑائیں۔ کیونکہ بھاگتے میں عظمیٰ کا گھٹنا ان کے پلنگ میں نکلے ہوئے زائد پٹی کے سرے سے ٹکرایا۔ ہنسی کو روکتی کھوں کھوں کرتی وہ ایک دوسرے پر لد گئیں۔ ٹکرانے سے گدگدی اٹھی اور فرش پر لوٹنے لگیں۔

"بجّو ـــــ کھوں ـــــ کھوں کھوں ـــــ"

"کھی کھی ـــــ کھی ـــــ" عظمیٰ نے جواب دیا۔

اب وہ جہاں بیٹھتیں، بس وہ گلابی جال پھیلنا شروع ہوتا ـ فیتوں کے پلندے کے پلندے چاروں طرف بکھر جاتے باریک ربڑ دار ریشمی ـ ڈوریاں چاروں طرف سے جکڑ لیتیں اور ان کی سانسیں ایسی پھولتیں کہ بوسیدہ گلے ہوئے بھیانک ٹسلو کے چرچر پھٹنے لگتے۔

اور پھر فرصت کے وقت جب سب سو جاتے تو وہ چھپکے سے لوٹ کا مال نکال کر اندھیرے کمرے کی سہانی تاریکی میں دیکھا کرتیں۔ ذرا ایک دوسرے کے سامنے کھل کر دیکھنے سے جھجک آتی تھی۔ لہٰذا ایک دن عطن نے اکیلے میں دیکھنے کی کوشش کی۔ مگر صفیہ چیل کی طرح جھپٹ کر پہونچی یہ بے ایمانی تھی سراسر بے ایمانی!

"آپا جی کو دے آئیں —" انہوں نے فیصلہ کیا۔

"اور کیا دے ہی آئیں — انور بھائی —" دونوں کے گلے رندھ گئے

ایک دوسرے پر اعتبار اٹھنا شروع ہوا۔ وہ ایک دوسرے کو اکیلا چھوڑتے ڈرتیں۔ سانپ کی طرح ایک دوسرے کی حفاظت کرتیں۔ اگر عطن اٹھ کر کسی طرف جاتی تو صفیہ فوراً جوتا پہننے لگتی۔ وہ محبت وہ لگاؤ ٹوٹ گیا۔ عطن کے درد اٹھا تو صفیہ منہ موڑے سوتی بنی رہی اور دوپٹے کی پٹیاں نہ باندھیں۔ جب صفیہ کی کمر میں ٹیسیں اٹھیں تو عطن نے گرم پانی کی بوتل لا کر نہ دی اور دعائیں مانگتی رہی۔ کہ ایسا درد اٹھے یا اٹھے کہ وہ بے ہوش ہو جائے پھر ہوش میں نہ آئے۔ لوگ سر پھوڑتے بین کرتے لال گوٹے کی اوڑھنی ڈال کر اسے قبرستان لے جائیں — اور ادھر وہ الماری کے آخری کونے سے وہ ریشم کے لچھے نکال کر — مگر کہاں! وہ دن بدن موٹی ہوتی نظر آئیں۔ صفیہ کے رخسار کی ہڈیوں پر دہکتے سرخ چٹے پھیلنے لگے تھے۔ اور عطن کا جوتا کاٹنے لگا تھا۔ وہ ہیبت زدہ ہو ہو کر ایک دوسرے کی تندرستی سے لرزتیں۔ دونوں یہ ظاہر کرتیں کہ وہ اس گلابی ریشم کے پھندوں سے بالکل آزاد

تھیں۔ اور ذرا بھی وہ ان کے گلے میں پھانسی نہیں لگایا کرتے۔

....

کہتے ہیں خدا جب دیتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ کبریٰ کا جہیز سل رہا تھا۔ آپا بی کو بلایا خالہ عباسی نے جمپر کترنے کے لئے۔

"کوئی چلتا ہے میرے ساتھ ــــ"! وہ عظمیٰ، صفیہ کی طرف دیکھ کر بولیں ان دونوں نے جیسے سُنا ہی نہیں۔

عظمیٰ تو اچھی بیٹی بنی بی کے پائنچوں میں جھول ڈال رہی تھی۔ قسمت کی ماری صفیہ بیٹی قینچی سے کترنوں کے پھولنسڑے اڑا رہی تھی۔

"چل صفیہ کی بچی تو چل ـــــ بیٹھی قینچی کا ناس مار رہی ہے۔ جلدی اُٹھ"

"کہاں" صفیہ چونکی۔

"عباسی خالہ کے اور کہاں ــــ جلدی اٹھ ــــ"

"آں ــــ اور بجّو" اس نے خوف سے آنکھیں پھیلائیں۔

"بجّو کام کر رہی ہے" ــــ بی غرائیں۔ عظمیٰ سر جھکائے سیتی رہی ڈر کے مارے ٹانگہ بھی نہ توڑ ڈالا کہیں پکڑی نہ جائے۔ صفیہ نے ایک قہر آلود نظر ڈالی۔ مگر کچھ شنوائی نہ ہوئی۔

عظمیٰ کے ہاتھ ہلنے لگے، دل زور زور سے پسلیوں سے ٹکرانے لگا۔

"لے بیٹی ذرا یہ دو ٹانکے بند میں لگا دے ــ" ملانی ماں نے پھینٹ اور خانے کی کترنوں کی مداری کے تھیلے کی شکل کی چیز دے کر کہا۔

جیسے ریل چھوٹی جا رہی ہو ــــ دھائیں دھائیں انجن کٹنے لگے۔

اٹھی بڑی بے پروائی سے گویا اسے ذرا بھی تو جلدی نہیں!

"لیجو بیٹی ـــــ بیر بٹن ـــــ" تایا ابا بیل گاڑی کے پہیوں کی سی آواز اپنی چپلوں میں سے نکالتے ہوئے آن پہنچے۔

"ذرا پان دھو کر پٹاری میں رکھ دینا بیٹی ـــــ ذرا چھینٹا دیدینا ـــــ"

آج تو مھی کو بھی اسے پیارے پیارے تکلے اتارنے کی سوجھ رہی تھی۔ اللہ۔ یہ تایا ابا۔ ایسا کولنج کا درد اٹھے کہ قبر ہی میں بند ہو۔

اگر ذرا دیر اور یہ تناؤ رہتا تو عظمیٰ کی رگیں پھٹ جاتی اور اس پر فالج گر جاتا جیسے تیسے کرتی وہ پہنچی۔ پولے پولے ہاتھوں سے جیسے چڑیا کا بچہ اٹھاتے ہیں۔ اس نے وہ جال اور ریشم کا گچھا اٹھایا۔ دبے پیر رکھتی جیسے نئی دلہن پہلی دفعہ حجلہ عروسی کی جانب جارہی ہو ـــ کھیل پائیل ـــ چپل نہ چرمرائے! آج اسے معلوم ہوا کہ وہ کس قدر بھدی تھی۔ خاموش چاندنی جیسی دھندلی روشنی میں وہ اندھیرے اسباب کے کمرے میں ہونٹ بھینچے کھڑی رہی . . .

چٹخنی چڑھانے میں کیا زور سے کھڑکی۔ وہ آواز دبانے کو زور زور سے کھانسنے لگی۔ پھر قدم جماتی وہ بڑھی اور ایک لمحہ میں ریشم اور زیتوں کا مختصر سا جال اس کی انگلیوں میں الجھنے لگا۔ جیسے ٹھنڈے پانی کی دھار کھول دی جو اس کی رگ رگ پر پھسل کر بہنے لگی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے بھینچا اور پھر چھوڑ دیا۔ سر سے سانپ کی کینچلی کی طرح مچل کر بکھر گیا۔ دوسرے لمحے وہ پر پرزوں سے آزاد ٹھنڈے ٹھنڈے اوس میں بھیگے ہوئے پھولوں کے جال میں جکڑ گئی۔ ایسا معلوم ہوا وہ اوپر اٹھنے لگی ـــ اوپر بہت اونچی

— ہلکی پھلکی پھکتی ہوئی تیتریوں کی طرح! سانس زور زور سے چلنے لگا۔ آنسوؤں کی چلمن نے گلابی پھولوں کے نتھنوں کو جھومتے دیکھا۔۔۔ میٹھے میٹھے تشنج سی انگلیاں اینٹھنے لگیں — مہین مہین سوئیاں کھٹکنے لگیں۔

دھڑ — ہڑ دھڑ۔ پھٹ! دروازے کی ڈھیلی چٹخنی ڈھلک گئی اور سامنے آپا بی اور ان کے شانہ پر صفیہ کی شریر آنکھیں چمکیں!

باہیں جھول گئیں۔۔۔۔ شانے ڈھلک گئے۔۔۔۔۔ اور سر نیچے جھکتا گیا — اور اس نے ننو آکے جانگیے کی چراند آتے ہوئے مہیب شلوکے میں آنکھیں چھپالیں!

مکتبہ اردو کی بہترین کتابیں

ٹیڑھی لکیر - عصمت چغتائی	=	۱۸ روپے
شیطان " "	=	۷ "
بادشاہت کا خاتمہ - منٹو	=	۶ "
منٹو کے افسانے "	=	۱۱ "
چند روز اور خدیجہ مستور	=	۷ "
نگری نگری پھرا مسافر - نثار عزیز بٹ	=	۱۶ "
اَن داتا - کرشن چندر	=	۵/۵۰ "
ٹوٹے ہوئے تارے - " "	=	۶ "
چپ ممتاز مفتی	=	۹ "
زندگی کے موڑ پر - کرشن چندر	=	۷/۵۰ "

ہیرو

سکھا نے چولھے کے آخری کونوں سے راکھ گھسیٹی اور چپٹی رکابی چوٹی تک بھر لی۔ حلق میں سے کڑوی کڑوی راکھ پھینکتا وہ نل کی طرف لپکا جہاں جھوٹے برتنوں کا ڈھیر کسی بھوہڑ کے بچے کی طرح مچلا پڑا تھا۔ دخل در معقولات سے چڑ کر مکھیاں اُلجھے ہوئے دائرے کھینچتی اوپر اٹھ گئیں۔ رکابی میں سے تھوڑی سی بھبوٹن پونچھ کر اس نے موری پر ڈال دی۔ وہ یہ غلاظت صرف

مکھیوں کے مارے نہ پھیلاتا، مگر آج نہ جانے کیوں اُسے ہر چیز پہ پیار آرہا تھا آج حمیدہ بی آرہی تھیں نا. ابھی تو چار گھنٹے تھے ریل کے آنے ہیں۔ آج وہ اٹھا بھی صبح تڑکے تھا. صبح ہی صبح چائے نمٹا کر شام کا مصالحہ بھی رگڑ دیا کہ کہیں باورچی بہانے سے روک نہ لے۔

آج لوگوں نے جان بوجھ کر برتن زیادہ جوٹھے کئے تھے. چھوٹی بڑی بیس بائیس رکابیاں چار ڈونگے، چھ پیالے، دو قابیں، تین ڈشیں اور ان گنت چمچے پچھیاں اور کانٹے، تین پتیلیاں، چار دیگچیاں اور سینیاں ـــــ اچھا بھلا ایک شریف بیٹی کا جہیز روز کے روز اسے مانجناں ہوتا ـــــ پر آج تو اسے کھل اٹھا۔ اتنا کام اور اوپر کے کام پر بس ایک چھوکرا۔ اس کا بس چلتا تو پیروں میں پھٹے اور بغلوں میں پر لگوا لیتا ـــــ کہ ایک ہی وقت میں سارے گھر کی پکار کا جواب دے دیتا۔

"ننھے میاں کے جوتے بھی ابھی لایا ـــــ کنھا ـــــ کتھے کی پیالی لایا دو منٹ میں ـــــ کیا گلابی پیچک؟ بس منے میاں کی فٹ بال میں ہوا بھر لوں تو ابھی لایا ـــــ اچھا لہسن ـــــ ادرک تو پیس دی اور رچنے ـــــ اچھا وہ اخبار سویرے والا ـــــ برف ـــــ برف کا پانی؟ جی ابھی لایا" ـــــ لوگوں کا بس چلتا تو اس کے چھوٹے چھوٹے پرزے کر کے نگل جاتے. مگر سکھا ہی تھا جو سینہ سپر کئے ہوئے ڈٹا ہوا تھا.

اب تو وہ اتنا سوکھا مارا بھی نہ تھا۔ نہ جانے لوگ اسے سکھا کیوں

کہتے تھے۔ حالانکہ اسے اچھی طرح معلوم تھا۔ کہ اس کا نام نور الدین تھا۔ پر لوگوں کے منہ دکھتے تھے۔ اس کا پورا نام لینے سے۔ تھا بھی تو کوئی من بھر کا نام ہونہہ! —— برتن مانجھنے میں اس کے خیالات کی ڈور کتنی ڈھیلی ہو جاتی۔ پرالی بان کا جونا بنا کر سرمئی راکھ سے وہ برتنوں کو بڑے اطمینان بھرے انداز سے گھسا کرتا —— جھائیں مائیں —— راکھ کی کسکساہٹ بھری جھنجھناہٹ اور بھی اس کے خیالات کے راستہ کو چکنا اور پھسلواں بنا دیتی۔ اس طرح تو اسے تھکن بھی تو نہ معلوم ہوتی۔ جالو کوئی منرے دار سانہ پر کسی لطیف نغمے کا الاپ کر کے اٹھا ہو۔ برتنوں کی چوکی پر رکھ کر وہ ذرا اپنے تن کی خبر لیتا۔ ایک بار نظر ڈالو تو وہ بالکل چچوڑی ہوئی ہڈی معلوم ہوتا۔ جسم اور کپڑوں پر اتنے رنگوں خوشبوں اور مصالحوں کے داغ لگ جاتے جیسے برس ہا برس سے اُسے فرش جھاڑنے کی جھاڑو کی طرح — استعمال کیا جا رہا تھا۔ وہ جھٹ پٹ میلی بنیان باندھ کر نل پر نہانا شروع کر دیتا۔ نہا دھو کر وہ بالکل اجلی قمیض پہن سولہ سنگھار کر اردو کی چوتھی کتاب لے کر بیٹھ جاتا۔ یہ وہ وقت ہوتا۔ جب وہ موریوں اور کیچڑ کی دنیا سے بہت اونچا ہو کر علماء کی سوسائٹی میں پہنچ جاتا اور عام طور پر اس شاندار وقت کو تباہ کرنے باورچی کی چھوٹی۔ مگر موٹی لڑکی عدیا اٹھلاتی جھانجھن بجاتی آن پہنچتی، آتے ہی وہ کوئی زک پہنچانے کی تدبیر سوچ نکالتی۔ کچھ نہیں تو نل پر کھڑی ہو کر زور زور سے چھپکے مارنا شروع کر دیتی "نہیں مانے گی کلوٹے"۔

"جل گنجے ـــ کوئی تیرے باپ کا نل ہے ـــ عدیا کالی تھی ـــ پر سکھا کے سر پر تو بھر ٹوکرا بال تھے۔ ایسے گھنے کہ ننھے میاں کو اس کے سر پر چپت مارنے کے لئے گردن پر سپاٹا بھرنا پڑتا اور گویا سپاٹا زیادہ تکلیف دہ ہوتا مگر مار پیٹ کے اصول سے قطعی نیچے گرا ہوا ـــ اور تحقیر کن!

"ہے ہٹھی! خود تو گنجی ہے ـــ چٹیا ہے کہ چوہے کی دم ـــ گنوارن کہیں کی۔"

"اور تو بڑا لاٹ صاحب ہے ـــ ہونھ ـــ عدیا کی اینٹھی ہوئی۔ گدی سے چار انگل اونچی لال پیلا کلاوہ پڑی چوٹی واقعی اس کی دکھتی ہوئی رگ تھی۔ کتنا وہ چلاتی پچھاڑیں کھاتی پر ظالم اماں ایسی اینٹھ کر بال گوندھتی کہ بالوں کی جڑیں تک ہل جاتی، اس کا سر دونوں گھٹنوں میں دبوچ کر چوٹی ایسی مضبوطی سے گانٹھتی گویا کوئی گھوڑی کس کر باندھ رہی ہو۔ ہر بل پر دانت بھینچ کر کہنیاں ہوا میں معلق تان کر ٹھوک ٹھوک کر جھٹکے مارتی کہ مجال ہو ایک رونگٹا بھی باہر باہر چھوٹ جائے۔ آٹھویں دن دو چار مسکین سی لیٹیں ذرا سا سانس لینے کو باہر رینگ آتیں اور ڈائن تیل کی کپی اور کنگھی لے کر پل پڑتی۔

عدیا کی اور سکھا کی چار منٹ کو بنتی اسے یوں گیانیوں کی طرح بیٹھا دیکھ کر عدیا کے تن بدن میں چنگاریاں سلگنے لگتیں۔

"آوے نہ جاوے بڑے پڑھ رہے ہیں" ـــ وہ اپنی لال اوڑھنیا فیشن ایبل انداز سے کاندھوں پر پھیلائے بالیاں جھلاتی آن پہنچتی۔

"دیکھ بھئی ہم تجھ سے نہیں بول رہے ـــ سُنا" ـــ وہ سنجیدگی سے ورق الٹ دیتا۔

"اور تم سے کون بول رہا ہے ـــ واہ جی واہ ـــ"

"اچھا ـــ نہیں مانے گی ـــ"

"ہونھ کوئی تمہاری کبوتر جیسی آنکھوں سے ڈر ہی تو جاؤں گی۔"

"اچھا ہم ادھر جاتے ہیں ـــ ہمت ہو تو آجائیو" ـــ وہ لمبے ڈگ مارتا اصطبل کی طرف چل دیتا اور اصطبل عدیا کی حدود سے باہر تھا باورچی کے احکامات صادر ہو چکے تھے۔ کہ اصطبل کی طرف گئی اور ٹانگوں کے پرخچے اڑے۔ عدیا سکھا کی بے مہریوں کی وجہ بھی جانتی تھی۔ اماں کمبخت کسی طرح سمجھتی ہی نہیں ویسے دن رات کی ٹیس ہے کہ کنواری لونڈیا سینے پر سل پڑی ہوئی ہے۔ کہو بھلا یہ زمانہ لال اوڑھنیوں کا ہے ـــ یا بہت ہوئی تو محرم پہ ہری بن گئی جو میلی کچیلی ہو گئی۔ تو اودی یا نارنجی کر والی ـــ بس ـــ ہاں سکھا ویسے ہوشیار تھا۔ مگر عدیا کونسی بری تھی۔ ہاں ذرا دماغ کمبخت کمزور پیدا ہوا تھا۔ بڑی بیوی جی نے اللہ ماری کی کمر پہ ہزاروں پنکھیاں توڑے مگر آم کے پارے سے آگے نہ پڑھ کے دیا۔

کاش وہ زندگی میں ایک بار صرف ایک بار حمیدہ بی جیسا باریک ململ کا ہوا جیسا گلابی یا آبی رنگ کا دوپٹہ اپنے شانوں پر ڈال سکتی یا مرہی کبوتر کے پروں کے رنگ کا بھورا بھورا ہلکا سا دوپٹہ یا کامدانی کا کپا سی

شان کا ہی سہی جس کی چنٹ دن بھر بھی اوڑھو تو بھی نہ کھلے — پر حمیدہ بی اوڑھتی بھی تو پورے پورے ہیں۔ یہ تھوڑی کہ اماں کا حکم ہر وقت "ارے نصیبوں جلی دوپٹہ آگے کو لے"۔ بس ہر وقت خون سرخ لٹھے کی کوٹھڑی میں گھٹے ہوتے سبکیا بھرا کرو۔

اور آج حمیدہ بی آرہی تھیں۔ عذرا کو حمیدہ بی رتی برابر پسند نہ تھی آتے ہی وہ اس کی جوؤں کی خیریت پوچھتیں اور آم کے پارے کا دردناک ذکر چھیڑ دیتیں۔ بڑی بیوی جی کو اپنی ہار پر نئے سرے سے تاسف ہونے لگتا اور وہ نیا آم کا پارہ منگا کر اس کی کمر پہ پنکھیاں توڑنا شروع کر دیتیں اور اس دفعہ تو انہوں نے بڑے مشہور مقام کے بالس کے چرخی دار پنکھے منگائے تھے جنہیں وہ پھر کنی کی طرح گھما کر مارتیں تو دوگنی چوٹ لگتی تھی۔ دوسرے حمیدہ بی تھیں بھی نک چڑھی کل ان کا کمرہ صاف کرنے وہ اور سکھا گئے تو چھپکلیوں سے ڈر کر عذرا تو کونے میں بیٹھ گئی اور سکھا مارا مارا کمرہ جھاڑنے لگا۔ حمیدہ بی کا کام کرتے وقت وہ ایسی تند ہی دکھاتا جیسے عقبیٰ کے لئے توشہ سمیٹ رہا ہو وہ جل کر رہ گئی املتاس کے زرد پھول گلدان میں لگاتے دیکھ کر وہ تحقیر پہ تل گئی۔

"املتاس سے تو جلاب لیا جاوے ہے"

"تو اور کوئی پھول ہیں بھی تو نہیں!"

"دیکھ لیجو پھینک دیں گی حمیدہ بی"

"ہونہہ ___ پھینک دیں گی ___ جانتی بھی ہے ۔ انہیں زرد رنگ کتنا پسند ہے؟"

"ہوں ___ جبھی پیلی بنیان پہنی گئی ہے ___"

سکھا کے کان خون کی شدت سے نیلے پڑ گئے یہ بات تو تھی کہ اس نے بنیائن سینت کر رکھی تھی۔ مگر عدیا کی کچی چڑیل کون ہوتی ہے۔ عدیا بھی سمجھ گئی کہ چوٹ گہری پڑی اور کھسک جانے میں ہی سلامتی ہے۔

کھلے میدان میں سکھا سے نبٹ لیتی مگر یہاں گھر میں تو سبھی اس کے دشمن تھے وہ تھی بھی بڑی بدنام۔ جب کوئی بلاتا تو سکھا کھانا کھاتا ہو جب بھی قلانچیں مارتا پہنچ جاتا۔ پر عدیا کو ذرا گنگنانے کا شوق تھا اس لئے لوگوں کی پکار ذرا کم سنائی دیتی۔

"میرے آتے ہوں گے ۔ چت چو دو و و ___ ر ___ وہ تیسری آواز پر چت چور کے تخیّل سے چونک کر سنتی پھر دل میں شبہ ہوتا کہ جانے بھائی کسی نے پکارا بھی تھا یا یونہی اس کے کان بجتے تھے ۔ جب پکار کی حقیقت واضح ہو جاتی تو پھر وہ متحیر" ہونا شروع کرتی کہ آخر کیا کام آن پڑا جو پکاری گئی ۔ سچ تو ہے ۔ پتہ تک نہ ہو کہ انسان کو کس کام کے لئے بلایا جا رہا ہے تو پھر کیا دل لگے جانے میں ۔ اور بہت ممکن ہے کوئی کام بھی نہ ہو اور صرف "کچھ نہیں" کہنے کے لئے پکارا جا رہا ہو ۔ بارہا ایسا ہوا کہ وہ اچھا بھلا پنج گٹوں کا میچ چھوڑ کر آئی اور جواب ملا ___ "اچھا کچھ نہیں" ___ "رہنے دو"

وہ چڑ کر رہ جاتی ایسے غیر مستقل مزاج آقاؤں کی یہی سزا ہے کہ پکارتے پکارتے کمبختوں کے نرخرے پھٹ جائیں جواب نہ دیا جائے دوسرے پکار کے جواب میں جب وہ پہنچتی تو بد قسمتی سے اتنی دیر ہو چکی ہوتی کہ پکارنے والے کی دماغی حالت کا بھروسہ نہ رہتا مار کا اندیشہ یقین کی حد کو پہنچ جاتا۔

ہر شام کو زرد رنگ کی ریشمی ساڑھی پہنے جب حمیدہ بی آئیں تو سکھا نے جھپٹ کر انہیں سلام کیا۔

"اوہو بڑے ٹھاٹ ہیں سکھا"۔۔۔۔ وہ مسکرائیں اور سکھا کا تیل میں ڈوبا ہوا ماتھا بینگن کا چھلکا بن گیا۔ اگر اس کے سامنے آئینہ ہوتا تو دیکھتا کہ پیلے بنیائن میں سے نکلا ہوا اس کا ملیو ترا چہرہ بالکل المناس سے کی پھلی معلوم ہو رہا تھا۔ علیا کونے میں کھڑی نتھنی کی گرہ کھماتی رہی۔

دوڑ دوڑ کر سکھا نے حمیدہ بی کا سارا سامان اوپر پہنچا دیا۔ چمڑے کا بھاری بکس ہاتھی کے برابر بستر اٹیچی کیس، تھرماس وائلن کا بکس، سفر کا کوٹ ایک بھی چیز اس نے نہ چھونے دی کسی کو۔

"کچھ نہیں ہوتا موٹلی بھینس ہے"۔ اس نے علیا کو اینڈ اینڈ کر پھلوں کی ٹوکری سے الجھتے دیکھا تو دانت پیس کر دوڑا، علیا نے اپنی ننھی سی ناک کو ایک طعن آمیز ٹھمکی دی اور ٹوکری کو جان کر دور دھکیل دیا۔ دو امرود دوڑتے ہوئے چبوترے سے نیچے جا گرے۔ ایک دفعہ ہی کھا

کا جی چاہا عدیا کو ایسے دھکا دے کہ امردودوں سے بھی چار ہاتھ آگے جا پڑے۔ مگر اتنے میں حمیدہ بی آگئیں اور اس کا غصہ بجھ گیا

جب وہ چائے لے کر اوپر پہنچا تو چائے کے برتن سینی پر پھدکنے لگے اور اسے جلدی سے میز کا سہارا لینا پڑا — سامنے آئینہ تھامے کھڑی حمیدہ بی اپنے بالوں میں زرد املتاس کے پھول لگا رہی تھیں "یہ تم نے لگائے ہیں سکھا"

"جی"! اس نے بلاٹنگ کی بھیگی ہوئی گڈیوں کو حلق میں بھینچا۔

لپک کر وہ بستر کھولنے لگا۔ کھولتے کھولتے جیسے اس کے کسی نے سوئی چبھو دی۔ اور دونوں تکیے ہاتھ سے چھوٹ پڑے قمیص! حمیدہ بی کی نہیں۔ مردانہ قمیص۔ سگریٹ کی بو میں غرق ملگجی ہوئی۔ اس نے قمیص اٹھائی پھر پھینک دی۔ پھر اٹھائی دو انگلیوں سے جیسے وہ کوئی سڑا ہوا چوہا چھو رہا ہو۔

"اوہ یہ قمیص!" حمیدہ بی کا سفر سے تھکا ہوا چہرہ سرخ ہو گیا۔ "اصغر بھائی کی ہے۔ بھولے سے آگئی" — انہوں نے بڑی بیوی جی کو بتایا۔

سکھا ایک دم مسکرا دیا — اصغر میاں کی قمیص! — توبہ اور کسی کی بھی نہیں اصغر میاں کی۔ وہی جن کی صورت دیکھ کر سارے دن کھانا نہ ملے۔ دس مرتبہ سال میں اپنی حمیدہ بی کے آگے ناک گھسنے آتے اور اپنی حمیدہ بی انہیں کبھی گنتی ہی میں نہ لاتیں سکھا ہی نہیں سارا گھر

جانتا تھا کہ حمیدہ بی کو شادی کے نام سے چڑ ہے۔ خصوصاً اصغر میاں کے تو ذکر ہی سے بھاگتی تھیں۔ قمیص کو ٹانگنے سے پہلے اس نے اسے خوب بے دردی سے جھٹکا۔ گویا اس میں سے پہننے والے کا جسم ہی جھاڑ پھینکنا تھا دو بٹن نکل کر دور جا پڑے۔

"انہیں اسی میں لگا دو" ــــــ لڑھکتے ہوئے بٹن کو حمیدہ بی نے جوتے کی نوک سے ٹھکرا کر کہا۔ سکھا کا دل ایک بار لپ سے اچھلا اور پھر متواتر جھکورے لیتا رہا۔ ٹھکرائے ہوئے بٹن پر ترس کھا اس نے اٹھایا اور واپس کاج میں پرو دیا۔

شام کو ٹینس کھیلتے وقت وہ برابر ان کی گیندیں اٹھا کر دیتا رہا۔ جب حمیدہ۔ بی زن سے گیند کو مارتیں تو کوئی چیز دندناتی ہوئی سکھا کے دل میں آ لگتی۔ وہ گیند کے پیچھے دوڑتا اور چوٹ کھائے ہوئے کبوتر کی طرح تلملاتی گیند کو ٹھنڈا ہونے سے پہلے ہی دونوں مٹھیوں میں دبوچ لیتا گیند دیتے وقت وہ دونوں آنکھوں میں اس مسکراہٹ کو سمیٹ لیتا جو حمیدہ بی کے شیریں لبوں پر بکھر جاتی۔

عذرا کے جھانجنوں کی آواز پر اس نے دھیان نہ دیا۔ وہ چنا ہوا ساگ لئے باورچی کے پاس جا رہی تھی۔ مگر اس کے جھانجنوں کی جھنکار موت کا گھنٹہ ثابت ہوئی۔ فوراً ابا ورچی کی پسلی پھڑکی اور اسے جانا پڑا۔ کاش حمیدہ

بی اس کے بھر تیلے ہاتھوں کی خدمت کا کچھ خیال کریں مگر نہیں۔

"جاؤ سکھا امی خفا ہوں گی" ـــــ انہوں نے آخری گیند بنا مسکرا کے ہی لے لی اور وہ سر جھکائے لوٹ آیا رات کو جھوٹے برتن سمیٹتے وقت اس نے حمیدہ بی کی رکابی سب سے اوپر رکھ لی۔ زیادہ برتن نہ رہیں۔ اس لئے نوکر چاکر عموماً ڈونگوں یا جھوٹی پلیٹوں ہی میں کھا لیتے تھے۔ مگر سکھا کو اس سے نفرت تھی۔ وہ سوکھی روٹی پر کھا تا مگر جھوٹی رکابی میں نہیں۔ مگر حمیدہ بی کی رکابی کتنے سلیقے سے جھوٹی کی گئی ہوتی تھی۔

ذرا سا کونہ سالن کا ـــ ایک آلو کا ٹکڑا، دو چار نازک سی ہڈیاں پھیلا کیا جھوٹی ہے رکابی۔ ننھے میاں کی طرح تھوڑی کر بھر بھر چمچہ ہر ڈونگے میں سے لے کر انبار تھوپ لیا اور شروع کر دی ترائی۔ جیسے نوالے نہیں بن رہے ہیں پہلوانی ہو رہی ہے، توبہ! دیکھنے کی نہ رہتی ان کی رکابی، شوربہ ٹپک رہا ہے چاول گر رہے ہیں، ہڈیاں اگال کی طرح چبا چبا کر تھوکی جا رہی ہیں۔ اوپر کی رکابی اس نے چوکی پر رکھ دی اور برتن کونڈی میں ڈالنے چلا گیا، واپس لوٹا تو رکابی غائب تھی۔

چوکی کے پاس عدیا بیٹھی اس میں سالن اور روٹی چور چور کر اپنی بلی کو کھلا رہی تھی مارے طیش کے سکھا کی صورت بھیانک ہو گئی۔ ایک بار ہی تو جی چاہا تو س کاٹنے کی چھری اٹھا کر سرخ ٹول کی گھڑی میں آر پار بھونک دے۔

"میں ۔۔۔ یہ ۔۔۔ یہ ۔۔۔ یہ ۔۔۔ میری ۔۔۔ وہ ہکلایا۔

"ہونھ ۔۔۔ چھوٹی رکابی ہے میں نے پنو کی پر سے لی ہے" عدیا اپنے باپ کو سنانے کے لئے چنچنائی۔

"اتنے برتن دھونا پڑیں تو پتہ پڑے ۔۔ ہونہہ"۔۔۔ باورچی کو گردن موڑتے دیکھ کر سکھا خون کے سے گھونٹ پی گیا۔

"وے بھائی اس ڈونگے میں کھا لے۔ کباب بھی میں نے تو کھایا نہیں۔ آج کچھ جی اچھا نہیں"۔۔۔ کرتہ سر کا کر باورچی پیٹ پر ڈفلی بجانے لگا۔

"میں کھانا نہیں کھاؤں گا"۔ اس نے کڑوے کڑوے آنسو حلق میں چوس لئے اور سر جھکائے برتن سمیٹتا رہا۔ عدیا نے ایک بار تیکھی سی نظر ڈالی اور ڈونگوں کا سالن پیالوں میں انڈیل اپنی کوٹھڑی کی طرف چل دی۔

"میری بلی کہتی آج کا سالن بڑا میٹھا تھا ۔۔۔ حمیدہ بی کی جھوٹن تھی نا"۔ جاتے جاتے عدیا نے طعنہ مارا۔ سکھا اتنا چھچھورا نہ تھا جو کوئی لوٹ کے بات کہتا پر جی

چاہا موہنڈی کاٹی کی تھوتھنی اسی بان کے جوتے سے رگڑ پھینکے۔ جس سے وہ قورمہ کا پتیلا مانجھ رہا تھا۔

"دیکھا امی! منع کیا تھا۔ پھر بھی چلے آ رہے ہیں۔ اصغر بھائی۔ نفرت ہے انہی باتوں سے" سکھا نے جھاڑو دیتے وقت بڑی بیوی جی سے کہتے سنا۔

"اوئی تو کیوں نہ آئے..... اللہ رکھے اس کا گھر ہے" بڑی بیوی بولیں۔

"پر، امی میری پڑھائی کا حرج ہوگا— یہ بھی کوئی بات ہے۔ اتنی جلدی کیا مار تھی آنے کی۔ ابھی ان کے یہاں سے ہو کر آ رہی ہوں۔ حمیدہ بی جھلائی ہوئی ٹھنناتی چلی گئیں اپنے کمرے میں، بیوی جی مسکرا کر رہ گئیں اور سکھا نے دیکھا کہ حمیدہ بی کی جان کو روگ سا لگ گیا۔ فکرمند اور گھبرائی ہوئی سی رہ گئیں۔ گاڑی کے وقت تو مارے پریشانی کے۔ برا حال ہو گیا۔ پڑھتی ہیں تو پڑھا نہیں جاتا۔ رنگ ہے کہ فق! کتاب کھولتی ہیں بند کر دیتی ہیں۔ ایک نظر دیوار پر تو دوسری نظر کلائی پر، اگر ہوتی سکھا کی دعاؤں میں کچھ گرمی ہوتی تو ریلیں لڑ گئی ہوتیں اور — مگر ریلیں نہ لڑیں ہاں اصغر میاں کی تقدیر ضرور لڑ گئی۔ ریت کی بوریوں جیسے چوڑے چوڑے پیر اٹھے وہ اوپر چڑھ آئے۔ یہ ان کی عجیب عادت تھی کہ راستہ میں ہر ایک کی مزاج پرسی کرتے جاتے۔

"کیوں بے رمو ...... کلف ٹھیک نہ دیا اب کے کالروں میں تو مارتے مارتے

اُلّو کر دوں گا“ ....

”اوہو سلام علیکم باورچی کیسے ہو... میں تو کہتا ہوں یہ قولنج کے دورے ہنہیں۔ قورمے کے ہیں ـــ کھانا کم کر دو“

”سلام بڑی بی ـــ ارے کیا ہوتم بھی شادی وادی نو کراتی نہیں“

”اے میاں جب کہو تب کرادوں“

”چار سال سے خاک چھنوا رہی ہو“

”اے بس امتحان ہولیں“

”لعنت امتحانوں پر ـــ کہاں ہیں ـــ کیوں بے سکھا بڑا لمڈھینگ ہوتا جا رہا ہے۔“ ـــ وہ ہمیشہ اس کے چپت مارنے کی کوشش کرتے مگر سکھا غوطہ مار کر صفا وار خالی دیے جاتا اور جب وہ آگے نکل جاتے تو اس کا جی بے اختیار مجرمانہ افعال کی طرف راغب ہوتا۔ چاہے کالا پانی ہو چاہے پھانسی بس ایک دفعہ کس کر ان کے موٹے کولھوں پر ایک لٹھ ٹکا ہی دے۔ واپس جاتے وقت اصغر میاں سب کو انعام دیتے۔ اس لئے سارے نوکر انہیں سلام کرنے برساتی میں جمع ہو جاتے مگر سکھا کو عموماً اس وقت کوئی ضروری کام لاحق ہو جاتا رخصتی سلام صاف بچا جاتا اور اگر وہ اس کے نام کی اٹھنی کسی کو دے جاتے تو وہ اسے زمین پر ڈال کر اس پر تھوک دیتا۔

”سکھا، اصغر میاں پوچھیں تو کہہ دینا میں سو رہی ہوں“ حمیدہ بی نے سکھا سے رازدارانہ انداز سے کہا اور جونہی حمیدہ بی کا نام آیا وہ چلا چلا کر کہنے لگا۔

”صاف! سو رہی ہیں حمیدہ بی“ ـــ مگر اصغر میاں مست ہاتھی کی طرح

چھوٹے کمرے میں گھس گئے اور حکم چلانا شروع کیا۔

"اچلو سیدھی طرح ٹینس کھیلو۔"

"اللہ سر میں درد ہو رہا ہے۔"

"تو لاؤ ہم ابھی اچھا کردیں۔" مگر حمیدہ بی ان سے بچ کر دور کونے میں جا کھڑی ہوئیں، لاکھ خوشامد کی مگر کمبخت نہ پسیجا۔ ہاتھ پکڑ کر گھسیٹ لایا۔

بس نہیں۔ وہاں تو حمیدہ بی کے حصے کا چین ہی اڑ گیا۔ حمیدہ بی چپکی بیٹھی کھانا کھاتیں مگر اصغر میز کے نیچے سے پیر ڈال کر ان کی پنڈلیوں میں چٹکیاں بھرا کرتے سکھا خاموش خون بھری آنکھوں سے ان کے اژدہے جیسے پیر کو میز کے نیچے رینگتے دیکھا کرتا۔ کاش اس کا بس چلتا تو وہ اس منحوس اژدہے کا پھن کچل کر اسے چولہے میں دبا دیتا اور جب دھیمے دھیمے سلگ کر راکھ ہو جاتی تو اس کے اپنے سارے چھوٹے برتن چمکا ڈالتی۔

ایک دن تو حد ہو گئی ڈرائنگ روم میں وہ صوفہ جھاڑنے گیا۔ تو اس کا دل لرز اٹھا۔ حمیدہ بی اپنے گھٹنوں میں منہ دیئے سسکیاں بھر رہی تھیں اور وہ انسانی گینڈا پاس کھڑا ۔۔۔ "تمہیں ہماری قسم" کہہ رہا تھا۔ سکھا کو بھونچکا دیکھ کر وہ کھسیا سے گئے۔ اور ڈانٹا۔

"ارے چل یہاں سے" ۔۔۔ مگر سکھا نہ ہلا۔

"نہیں ۔۔۔ مت جا سکھا۔ حمیدہ بی نے منہ اٹھا کر کہا۔

"میں کہتا ہوں ۔۔۔ ابے سکھا کے بچے ۔۔۔ جاتا ہے کہ ۔ ۔ ۔ ۔"

"خبردار جو سکھا تو گیا ۔ ۔ ۔" حمیدہ بی نے پیار سے ڈانٹا۔ سکھا پتھر کے

بت کی طرح جم کر کھڑا ہو گیا ـــ اصغر ایسے سو پچاس بھی آجائیں تو اگر حمیدہ بی حکم نہ دیں تو وہ چٹان بن کر ڈٹ جائے ۔ چاہے وہ اس کی لاش کو کچلتے جائیں مگر

"اچھا یہ بات ہے تو . . خیر،، ـــ اصغر میاں سکھا کے آہنی ارادہ سے ہار کر حمیدہ بی پر حملہ آور ہوئے مگر وہ ہرنی کی طرح چھلانگیں مارتی اپنے کمرے میں غائب ـــ دروازہ بند ـــ !

رات کو جب تھکا ہارا سکھا پلنگ پر لیٹا تو بان کا ہر تار بچھو کے ڈنک کی طرح اسے ڈسنے لگا۔ جسم نیند کے لئے مچل رہا تھا ـــ پر نیند کہاں ؟ وہ پریشان تھا اور یہ پریشانی بے بنیاد نہ تھی ۔ حمیدہ بی دن بدن روہانسی اور چڑچڑی ہوتی جاتی تھیں اور آج تو وہ رو رہی تھیں ۔ وہ کمبخت کھڑا رلا رہا تھا ۔ اس سے بچنے کے لئے وہ ہر وقت ڈری ہوئی ناخنہ کی طرح چھپتی پھرتی تھیں ۔ حمیدہ بی ! وہی جنہوں نے اس دن املتاس کے پھولوں کا گچھا بالوں میں لگالیا تھا تو ایسا معلوم ہوا تھا جیسے کالی رات میں تاروں کے گچھے جگمگا اٹھے ہوں ۔

اس نے زور زور سے اپنی کھردری ہتھیلیاں بھلنگے کی پٹی پر کھیں ، کاش وہ ان میں پچی ہوئی کھجلی مٹا سکتا اور پھر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس نے اصغر میاں کے جسم پر سے وہ سبز دھاریوں دار قمیض کھینچ کر اتار لی ہے ۔ اور اب ان کی کھال کو جی کھرچ رہا ہے ۔ کانٹا لے کر اس نے انہیں مسلم کی طرح گودنا شروع کیا ، چوڑے کندھے موٹے موٹے بازو ، رانیں پنڈلیاں اور پیڑی مرغی کے رنگ کے تازہ شیو کئے ہوئے گال ، وہ برابر نمک مرچ اور لیموں لگا لگا کر ننھے ننھے خون بھرے گڑھے بناتا رہا ۔ پھر دانت کچکچا کر ایک بار ہی ان گستاخ آنکھوں کو کانٹوں میں پرو کر سکے

میں ڈبو دیا، اس ذہنی قتل کی دہشت سے وہ بالکل تھک گیا۔ جسم کو سیدھا ڈال کر وہ جھونپڑے میں دبک گیا۔ رات بھر وہ کچھ نہ کچھ کرتا ہی رہا اس کا ہمزاد اسکیمیں بناتا اور ان پر عمل کرتا رہا۔ کبھی حمیدہ بی کو اژدہوں سے بچا رہا ہے۔ کبھی دریا کی بڑی بڑی لہریں منہ پھاڑے لپکی چلی آرہی ہیں۔ مگر وہ موٹر جیسی تیزی سے انہیں بچالے جاتا ہے۔ بڑے بڑے کالے پستول لئے ڈاکو آدھے منہ پر ڈھاٹھا باندھے حمیدہ بی کے کمرے میں جھانک رہے ہیں اور سکھا ان سے بھڑا جا رہا ہے اور پھر بچائی ہوئی حمیدہ بی کو وہ صابن کے جھاگوں کی طرح دونوں ہاتھوں کے چلو میں ہلکے ہلکے دھواں بنتے دیکھتا ــــ وہ غائب ہو جاتیں۔

صبح ہی صبح اصغر میاں کے کوچ کا ذکر سن کر سکھا بے اختیار کرسی کے پیچھے راکھ پونچھنے کے بہانے منہ چھپا کر مسکرا دیا۔ یقیناً وہ اس کے ارادوں سے دہشت زدہ ہو کر بھاگ رہے تھے۔ دم دبا کر۔

"راحت تیرے کی"۔ اس نے چاہا زور سے چلا کر کہے مگر وہ چپ ہو گیا حمیدہ بی کچھ بگڑی روٹھی سی اپنے کمرے سے نکلیں اور عدیا کو پکارنے لگیں،

"جی ــــ صاحب" سکھا حسب عادت بولا۔

"تم نہیں عدیا" ــ سکھا کا منہ اتر گیا۔ باوجود کوششوں کے وہ عدیا کی ضرورت کو دنیا سے نہ میٹ سکا۔ اس کا خون تیل کی طرح کڑ کڑانے لگتا۔ جب وہ اسے حمیدہ بی کے ننجی کپڑے دھوتے وقت انہیں کیچڑ میں ساتا دیکھتا اس وقت بھی جب جماہیاں لیتی گنگناتی عدیا جینا بطخ کی طرح ٹانگیں مارتی آئی تو سکھا بھلس کر رہ گیا۔

جان بوجھ کر اس نے کپڑے تین دفعہ گرائے اور انہیں بجائے ہاتھ میں اٹھا کے پیروں سے گھسیٹتی غسلخانے تک لے گئی۔ سکھا کا دل گھسٹتا چلا گیا

"ہاتھ ٹوٹے گئے ہیں" ۔ وہ غرایا۔

"ارے تم کون جمعدار جی ۔۔۔ ایسی لے جائیں گے"۔

"متی دھوسے مجھے دے"۔

"نہیں ۔۔۔ تمہارے دھونے کی نہیں ہیں"

"بکے مت ری"

"لو ۔۔۔۔ لو ۔۔۔۔ لو" ۔۔۔ عدیا نے ناگن کی طرح پھنکار کر سارے کپڑے سکھا کے منہ پر مار دیئے اور چلاتی ہوئی بھاگی حمیدہ بی کے کمرے کی طرف وہ سہما ہوا کپڑے سمیت بس رہا تھا کہ حمیدہ بی لرزتی کانپتی نکلیں ۔۔۔ اوہ! وہ جلدی سے ایک کونے میں کھڑا ہو گیا ۔۔۔ عدیا نے نتھنی کو معنی خیز ٹھسکے سے ذرا اچکایا اور مسکراہٹ روکتی، ناک بجاتی کپڑے سمیٹے چل دی۔

اس دن سکھا سارا دن خوفزدہ اور سہما ہوا منڈلاتا رہا، وہ کبھی حمیدہ بی کو دیکھتا کبھی اصغر میاں کو ۔۔۔ اور کبھی عدیا کو لیکن تینوں کے پاس سے اس کی نظریں لاجواب لوٹ آئیں، جھاڑو دینے کے بہانے سے اس نے اصغر میاں کی جیبیں ٹٹولیں مگر وہاں تو سوائے ناخن کاٹنے کے چاقو کے اور کچھ نہ ملا۔ اصغر کی نیت خراب تھی، کیا عجب جو جانے سے پہلے کچھ کر بیٹھے۔ سارا دن وہ کسی نہ کسی بہانے سے ان کے پیچھے لگا رہا۔ دو ایک بار اصغر میاں نے شبہ سے دیکھا۔ مگر اس نے ایسی صورت بنالی جیسے کچھ ہوا ہی نہ۔ مصیبت یہ تھی کہ وہ

لوگ باتیں بھی تو انگریزی میں کرتے تھے۔ سوائے ”یس“ اور ”نو“ کے کوئی بات پلّے نہ پڑتی۔ لیکن اگر دونوں کو جمع کیا جاتا تو یقیناً ”نو“ کی تعداد پچاس گنی زیادہ ہوتی اور حمیدہ بی کی ہر ”نو“ پر اصغر کا رنگ پھیکا اور سکھا کا تیز ہو جاتا۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ سکھا باورچی سے مسالہ کی قاب لئے باورچی کو دینے جا رہا تھا کہ پتّوں میں آہٹ ہوئی اور پھر کسی نے اس کے پیر زمین میں گاڑ دیئے۔

”نو“ حمیدہ بی کی تھکی ہوئی آواز آئی۔ سکھا کے جسم میں چنگاریاں سی لپکنے لگیں اصغر کی بھاری سڑک کوٹنے کے انجن جیسی آواز ان کی آواز کو پیستی ہوئی گھڑگھڑائی چاند کی پھیکی روشنی میں اس نے حمیدہ بی کا کاغذ جیسا سفید چہرہ ایک رخ کو مڑا دیکھا اصغر ان کا ہاتھ پکڑے کھینچ رہا تھا اور وہ بل کھائے جاتی تھیں۔

”آہ!“ حمیدہ بی کے منہ سے آخری بار نکلا اور پھر اصغر نے ان کا منہ بند کر دیا بھڑوں کا چھتّہ کانوں کے راستے سکھا کے دماغ میں گھس گیا۔ دوسرے لمحے میں وہ ان کے سر پر تھا۔ بھاری مسالہ کی قاب اس نے پوری طاقت سے اصغر میاں کے سر پر دے ماری اور چاروں شانے چت دھکا مار کر سینے پر چڑھ بیٹھا مگر ایک دم ہی اس کے اوپر اونچی ایڑی کے جوتوں اور تیز ناخنوں کے ٹکڑے کے ٹکڑے برس پڑے۔ بدحواس کتے کی طرح وہ جھاڑی میں جسم کو کھردنچے لگاتا اندھا دھند بھاگا۔

”یہ کیا ہو گیا تھا لے“؟ اس نے اصغر کو کہتے سنا۔

”نہ جانے سے دماغ خراب ہے۔ پگلے کا۔ آپ کے چوٹ تو نہیں لگی“۔

دوسرے دن صبح جب عدیا چائے لینے باورچی خانہ میں گئی تو نل کے پاس

موٹی سی گردن کا سانڈ جیسا مردوا بیٹھا برتن مانجھ رہا تھا۔ اللہ جانے اس نے کیا کہا کہ وہ سہمی ہوئی باورچی کے بالکل پاس جا کھڑی ہوئی، "یا کتنا دھواں ہے۔ باپ رے باپ"! اس نے کیل پر ٹنگی ہوئی پیلی بنیائین دیکھ کر ٹول کے سرخ دوپٹے میں آنکھیں چھپالیں اور باہر بھاگ گئی!

ہیروئن

تالی ہمیشہ دو ہاتھ سے بجتی ہے۔ ادبی تالی بجانے کے لئے دو ہاتھوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور عرف عالم میں ان ہاتھوں سے ہمارا مطلب ادب کے ہیرو اور ہیروئن سے ہے۔ یوں تو ایسا ادب بھی ہے۔ جس میں ہیرو اور ہیروئن نہیں۔ وہ ادب بھی ایسا ہی ہے۔ جیسے کسی نے ایک ہاتھ اور پیر کے تلوے کی مدد سے تالی بجادی ہو۔ ایسی تالی بج تو گئی مگر کتابوں کی جلدوں ہی میں گونج کر رہ گئی۔ عوام تک اس کی رسائی نہ ہو سکی اور اگر سارے ادب میں ہیروئن اور ہیرو نہ ہوتے تو یقیناً یہ خشک ستو بن کر حلق میں پھنس جاتا۔

عوام کی توجہ حاصل کرنے کے لئے بندر بندریا کو ڈگڈگی بجا کر نچانا پڑتا ہے۔

ویسے اگر وعظ کرنے کھڑے ہو جائیں یا حالات زمانہ سنانے لگیں تو ظاہر ہے کہ کوئی بھی نہ سنے گا دیکھے نا محکمہ تعلیم اور مسجدوں سے لوگ کتنا کترا کر نکلتے ہیں گے

لہٰذا جب کسی کو کچھ کہنا ہوتا ہے تو بندر بندریا کے گلے میں ڈوری باندھی اور ڈگڈگی بجانا شروع کر دی۔ ہیرو اور ہیروئن کے رسیلے کارناموں سے ایسی رنگینیاں بھریں کہ لوگ ٹوٹ پڑے۔ کچھ احساسات کو پھسلایا۔ کچھ جذبات کو گدگدایا اور مطلب حاصل ہو گیا۔ شعبہ تعلیم میں سب سے زیادہ اہمیت، دلچسپ اسباق کو حاصل ہے۔ ہر بات ایسی صورت میں پیش کرنی چاہیئے کہ بچے اس میں گلی ڈنڈے اور کبڈی کی رعنائیاں پاکر متوجہ ہو جائیں۔ ادب کا بھی کچھ یہی حال ہے۔ کڑوی سے کڑوی خوراک شکر میں لپیٹ کر دے دیجئے۔ لوگ واہ واہ کر کے نگل جائیں گے رامائن اور مہابھارت کا زمانہ کیوں اب تک کل کی بات بنا ہوا ہے۔ عظیم بیگ چغتائی نے قرآن کی مدد سے پردہ کو چاک کرنا چاہا مگر سوائے مولویوں کی جوتیوں کے کچھ نہ ملا۔ لیکن "شریر بیوی" نے کونین کھلا کر اور "کولتار" نے عقلوں پر سیاہ پردہ ڈال کر حجاب کو مار بھگایا۔ علامہ راشد الخیری اور پریم چند جی اگر ہیرو ہیروئن کے کندھوں کا سہارا نہ لیتے تو آج بجائے لوگوں کے دل و دماغ کے، صرف بوسیدہ کتب خانوں میں پڑے اونگھ رہے ہوتے۔

"ادب اور زندگی، ادب اور سماج، ادب اور تاریخ میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اگر انہیں ایک دوسرے سے جدا کرنے کی کوشش کی جائے تو دونوں مٹ جائیں گے۔ دوسرے معنوں میں اگر ادب سے زندگی یعنی ہیرو اور ہیروئن کو الگ کر دیا جائے تو ایک خلا رہ جائے گی۔

ہیرو سے زیادہ میں اس وقت ہیروئن کی حیثیت (جو ادب میں ہے) پر غور کرنا چاہتی ہوں۔ ہیروئن "جام جم" کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ اس پر ایک نگاہ ڈال کر ہی ہم اس کے زمانے کی اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی حالت کا اندازہ لگا سکتے ہیں، مثلاً "فسانہ آزاد" کی عورت کو دیکھ کر جو اس زمانے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس وقت جو قابل ذکر عورت تھی۔ وہ نہایت مہذب تعلیم یافتہ اور دلچسپ طوائف تھی۔ سرشار کو بھلا شریف گھرانے کی عورت کہاں ملی ہو گی، اور وہ بھی مسلمان خاندان کی۔ اس وقت شریف بیویاں تو گھر میں بیٹھی ہنڈیا چولہے سے سر مار رہی ہوں گی، سڑی بسی بے ڈھنگی خادمائیں جن سے اکتا کر لوگ طوائفوں کی آغوش میں سکون دل و دماغ تلاش کرنے جاتے تھے۔ یہ طوائف اتنی بازاری اور کاروباری قسم کی نہ تھی۔ وہ بالکل شریف زادیوں کی طرح رہتی مگر شریف زادیوں سے زیادہ خوش مذاق اور لطیف تھی ظاہر ہے کہ طوائف کی حیثیت بالکل ایک باغ عام کی سی تھی جو عوام کے چندے سے عوام کی خوشنودی کے لئے قائم کیا جائے۔ ہر مرد کی اتنی حیثیت کہاں کہ تعلیم یافتہ یا سلیقہ بیوی شاندار مکان میں پھولوں سے لدی اور عطر میں بسی ہوئی رکھ سکے۔ لہٰذا اس نے اس کا نہایت آسان علاج نکالا۔ گھر میں تو بیوی رکھی جو علاوہ نسل بڑھانے کی دوسری ضرورتوں کو بھی پورا کرتی رہی اور بازار میں طوائف جو جذبات لطیفہ کی پال پوس کرتی رہی یہ بڑا کار آمد انتظام ثابت ہوا۔ گھر بھی رہا اور رنگینیاں بھی۔

مگر طوائف کی سوکن گرہستن نے شرارتیں شروع کر دیں اگر میاں سکون روح کے لئے طوائف کے یہاں گئے تو وہ بھی محلہ ٹولہ میں آنکھ لڑانے لگی۔ مجبوراً وہ شوہر

جنہیں در باغ عام کی سیر ذرا مہنگی پڑتی تھی۔ واپس گرہستن کی طرف لوٹ پڑے سوچا کر چورا ہے کی ہانڈی سے تو اپنی دال روٹی،، ہی بہتر ہے۔ عورت بھی کچھ شیر ہو گئی۔ اس نے وہ سب کچھ سیکھنا شروع کیا جس کی تلاش میں شوہر طوائف کے پاس جاتا تھا۔ مگر آہستہ آہستہ اس نے قدم بڑھائے۔ اہنسا کی پالیسی کے ماتحت طوائف کے در سے بھیک مانگ کر عزت اور توجہ حاصل کرنا شروع کی۔ سرشار فتحمند طوائف کو شکست دے کر پریم چند گی گرہستن و بے بیر گھونگھٹ کاڑھے قدم قدم پر پیر چومتی، ماتھے ٹیکتی، ادب میں رینگنے لگی۔ با۔۔۔
اپنے ہی گملے میں چھوٹی موٹی کا کلہ پھوٹتے دیکھ کر کچھ متحیر کچھ مغرور، امی کی سینچائی کرنے لگے۔ رنڈی تو خیر تھی ہی مگر یہ میٹھی میٹھی، معصوم سی بے مزہ چیز کچھ ایسی پیاری معلوم ہوئی کہ طوائف کا پلہ اچک گیا، اس کی خوبیاں عجیب ہو گئیں، وہی ناز و ادا جس کی تلاش میں ناکیں رگڑے جاتے تھے۔ رنڈی کے چھل بن گئے۔ چورا ہے کے نل کو گندہ کہہ کر لوگوں نے اپنے ہی گھروں میں کوئیں کھودنا شروع کئے۔ مگر یہ کنوئیں روز بروز گہرے ہوتے گئے یہاں تک کہ کنارے ہاتھ سے چھوٹ گئے اور ڈوبنا پڑا، طوائف بہت جھلائی، بہت بگڑی مگر تاج سدا ایک کے سر نہیں رہتا ناعاقبت اندیش نے پھل تو کچے پکے خوب کھائے مگر نئی پود نہیں لگائی اور ادھر معصوم گھونگھٹ والی نے نئی پود بھی لگائی اور پرانوں کو بھی سینچا۔ نتیجہ یہ کہ رنڈی کے کھنڈروں کو میت کر گرہستن نے دنیا بنانی شروع کر دی اور پھر اس کی کمان چڑھ گئی، وہی ایڑی تلے کچلنے والے مرد اس کی حمایت میں ایک دوسرے کو لعنت ملامت کرنے لگے۔ ایک دوسرے کے عیب کھول کر شاہراہ عام پر بیٹھ

دے وہ خود غیر جانبدار رہی۔ نہ کسی سے لڑی نہ بھڑی اہنسا کی قائل مگر جیسے گاندھی جی برت رکھ رکھ کر گورنمنٹ کو بوکھلا دیتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جھگی جھکی آنکھو سے نقاب کے پیچھے سے حشر برپا کرنے لگی، لیکن اب بھی پوری فتح حاصل نہ ہو سکی، کیونکہ طوائف کے بعد فیشن ایبل میم یا پارسن نے کچھ نہ کچھ حصہ میدان کا بکھرے رکھا۔ ادب کی اس قسم کی ہیروئن نے ہر کہانی اور ہر قصہ میں گھسنا شروع کیا مگر وہ جس نے طوائف کو مار بھگایا۔ اس میم سے کیا دبتی۔ اس نے اتنا تو معلوم کر لیا کہ گھر میں بیٹھنے سے کام نہیں چلے گا۔ مرد مجبوراً اسے گھر میں بند کر کے اکیلا باہر جاتا ہے۔ مگر وہاں وہ اکیلا رہ نہیں سکتا۔ وہ سیدھے ہاتھ میں چھڑی اور الٹے ہاتھ میں عورت چاہتا ہے۔ تقویت دل و دماغ کے لئے گھر میں رکھی ہوئی معجون دفتر اور کاروبار میں بھلا کیا مدد پہنچا سکتی ہے۔ لہٰذا وقتی گذارے کے لئے اس نے دفتر ہی میں دور بیٹھی ہوئی ٹائپسٹ، کبھی کبھی نظر آجانے والی منیجر کی حسین لڑکی اور ایسی ہی اکا دکا ہیروئن ڈھونڈ کر جسم تاپنا شروع کر دیا، اس کے جواب میں "گودڑ کا لعل"، "روشنک بیگم"، "زہرہ بیگم"، کی ہیروئن کو دیکھ کر ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ عورت کی جنگ برابر جاری رہی اور جیت آخر میں اسی کی ہوئی۔

مگر اسے پھر بھی قرار نہ آیا ــــ اس نے تو بالکل ہی طوق گلو بننے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ اور بڑھی۔ پہلے تو گھر کی چار دیواری میں رشتہ کے بھائیوں ان کے دوستوں اور پاس پڑوس والوں سے آنکھ مچولی شروع کر دی۔ عظیم بیگ کی ہیروئن کے پردے اور برقعے کے تانے بانے کے اندر کشتیاں پچھاڑنی شروع کر دیں۔ موقع بے موقع سر پر چڑھ بیٹھی۔ گردن میں جھول گئی۔ سینے سے آن لگی۔ پر چھپے ڈھکے جلوے

اور بھی زیادہ گدگدانے لگے۔ طوائفوں کے نخرے بھانے اور پریم چند کی اہنسا کی قائل مقدس چیلی، بیوقوف اور بزدل نظر آنے لگی۔ اس کے گیگلے پن سے جان جل گئی جتنا بھی وہ ناک رگڑتی گئی۔ اس سے نفرت ہوتی گئی۔ یہاں تو اب صرف وہ ہیروئن پیر جما سکتی تھی جو منہ کا نوالہ اچک لے بھڑوں کا چھتہ منہ پر اونڈھا دے۔ بجائے میٹھی میٹھی نظروں کے کونین میں بجھے ہوئے تیروں سے کام، وہ ہن کی تواضع کرے پڑھی لکھی چاہے خاک نہ ہو مگر وقتاً فوقتاً تھپڑ اور چانٹوں سے گال سینک دے تنخواہ کم۔ گذر مشکل لیکن اگر ایسی شوخ شلیتہ بیوی ہو جو سارے دکھ درد چٹکیوں میں اڑا دے۔ تو پھر کون جنت کی آرزو میں مرے۔

مرد، عورت کے ظلم سہنے کے لئے ہی پیدا ہوا ہے۔ اس کے بغیر تو جنت بھی بھی رہنے کو تیار نہ ہو سکا، حضرت آدم نے بیٹھے بٹھائے پسلی چیر کر اس فتنے کو نکال ڈالا اور اپنے سر پر سوار کر لیا خواہ بیوی ہو یا رنڈی جو لگام پکڑ لے ہنکے چلے جائیں گے جتنے کوڑے زیادہ پڑیں گے۔ چال میں مستی اور روانی بڑھتی جائے گی۔ مگر ہر بات کی حد ہوتی ہے۔ دل کے ساتھ ساتھ وہ قول و فعل کی بھی چوکیدار بن بیٹھی اور دماغ کی پاسبانی شروع کر دی۔ سانپ کے منہ کی چھچھوندر بن گئی جو نگلی جائے نہ تھوکی جائے چھتری، ٹوپی اور برساتی کوٹ کی طرح ساتھ ٹنگ کر رہ گئی، یہاں تک کہ مرد چیخ اٹھا سب سے پہلے پطرس قبوے اور ان کے بعد عظیم بیگ اور شوکت تھانوی بھی چیخ چیخ کر دہائی دینے لگے۔ ادھر چچا چھکن، منشی جی، مرزا جی اور ہزاروں جی بھی پکار اٹھے

”بڑی زیادتی ہے بیگم! ہمیں ہنساؤ، مگر اتنا کہ پیٹ میں درد اٹھنے لگے“

ادھر ہیروئن ڈھیلی ڈوری کھینچتی گئی۔ اس نے یہ راز بھی معلوم کر لیا کہ اگر وہ

ذرا دبی ہوئی ہے تو سوائے اس کے اور کوئی بات نہیں کہ میاں پلیسوں پر اکڑتے ہیں کیوں نہ یہ چار پلیسوں کی کمان توڑ کر الگ کر دی جائے۔ لہٰذا محلہ ٹولہ کی سلائی سے شروع کر کے اقتصادی بازار کے ہر کونے میں رینگنے لگی، اس نئے روپ نے اس میں چار چاند لگا دیئے۔ ویسے عورت اگر بھیس بدل کر آئے تو خود اس کا میاں اس پر عاشق ہو جاتا ہے۔ جب کمانے نکلی تو یوں معلوم ہوا جیسے کوئی شاندار سرکس شہر میں آگیا ہے۔ عورت اسکولوں میں پڑھا رہی ہے۔ ملاجی ہکا بکا منہ پھاڑے رہ گئے۔ عورت ڈاکٹر بن گئی۔ حکیم جی مارے حیرت کے پلکیں جھپکانے لگے۔ عدالت میں وکیل مخالف کو بوکھلاہٹ کے مارے کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ ”ہٹو! بچو! عورت آرہی ہے۔“ لوگ گھبرا کر الٹ گئے اور وہ دھڑا دھڑ میدان مارنے لگی، اقتصادیات کے میدان کے ساتھ ساتھ بھلا وہ دل کی دنیا کو کیوں نہ تاراج کرتی، لہٰذا ہر طرف تباہی مچا دی۔

تو۔۔ یہ کمانڈر ہیروئن جسمانی اور دماغی اعتبار سے چاق و چوبند، بالکل لیٹرول کی طرح چاروں طرف ہاتھ مارنے لگی۔ اب تو مذاق کی حد ہو گئی۔ خیر کونین کھلاتی کھلاتی بھی تھپیڑ لگاتی تھی تو کوئی مضائقہ نہ تھا۔ یہ تو ایک عورت کے نخرے ہوئے جو کیداری کرتی تھی۔ ذرا سی بات پر آنسو بہانے لگتی تھی۔ ہمزاد بن کر وقت بے وقت سوار رہتی تھی تو کیا تھا! ہاتھی تو اپنی دست نگر اپنی بلی تھی کبھی پنجہ مار بیٹھتی ہے۔ مگر خرخر کر کے پھر اپنا نرم گرم جسم پیروں سے رگڑ کر منا بھی تو لیتی ہے۔ فیشن بھی کرتی ہے۔ خراج ہے تو کیا۔ ہے تو اپنی۔ ہمیں سے تو مانگ کر اتراتی ہے۔ ہمارے ہی پیسوں سے تو اٹھلا اٹھلا کر پیسہ نکالتی ہے، لیکن یہ بالکل مردانہ

دار، اقتصادی دنیا میں خم ٹھونک کر جو خود اپنی کمائی کہہ کر کھسوٹ لے جاتی ہے یہ تو سراسر ڈاکہ زنی ہے سر صاف دھوکہ!

نتیجہ یہ کہ بڑی جلدی پر ہیروئن بن گئی۔ بہت سمجھایا۔ صاف صاف دکھایا دیا کہ ایسی خود سر اور خود مختار عورتوں کا برا بد انجام ہوتا ہے۔ حرام کے بچے پیدا ہو جاتے ہیں۔ عصمتیں خاک میں مل جاتی ہیں، ساری دنیا جہنم میں ٹھونک دی، دفتر میں کلرک بہکائے جاتے ہیں، ہسپتالوں میں ڈاکٹر روگ لگا دیتے ہیں، اسکولوں میں ماسٹر عاشق ہو جاتے ہیں، ادھر والدین کو شمع ہدایت دکھائی، اسکول میں ہر لڑکی کو کم از کم ایک بار ضرور ناجائز بچے کی ماں بننا پڑتا ہے۔ پڑھنا لکھنا کچھ نہیں صرف عشق بازی سکھائی جاتی ہے۔ "شرم دلائی"، بیٹیوں اور بیویوں کی کمائی کھاتے ہو۔ ڈوب نہیں مرتے"، یہ ماسٹر دیکھنے میں کھٹانی چلسے جرخ مگر ہر ایک اپنے وقت کا مجنوں اور فرہاد ہے۔ اس وقت کی جو کہانی اٹھا کر دیکھئے، بس استاد اور طالبہ کے پرسوز عشق اور عبرتناک انجام سے پر نظر آئے گی۔

یقیناً یہ ادب بھی اپنا اثر دکھاتا اور ہیروئن واپس پتی کے چرنوں میں سرنگوں ڈھکیل دی جاتی۔ بات یہ ہوتی کہ بازار میں نہ جانے کیوں لڑکوں سے زیادہ لڑکیوں کی مانگ ہوگئی اگر ایک گریجویٹ بیس روپیہ کماتا تو لڑکی ایک سو بیس مار لیتی، جوں جوں تعلیم نسواں کار آمد ہوتی گئی، تعلیم مرداں نقد دل اور بیکار بنتی گئی، ہیروئن نے پیر مضبوط جما دیئے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک عجیب و غریب کشمکش شروع ہوگئی۔ تعلیم یافتہ لڑکیوں کی مانگ بڑھی مگر اس تیزی سے نہیں جس تیزی سے تعداد بڑھی۔ جب ایک میٹرک پاس لڑکی عنقا سمجھی جاتی تھی۔ اب

گی گی گریجویٹ آگ آئیں۔ شادی کے بازار میں بڑی افراتفری مچ گئی۔ ایک پڑھی لکھی لڑکی کے لئے کم از کم آئی بی۔ایس،، یا پی سی ایس،، تو ہو کاش گورنمنٹ لڑکیوں کی تعداد دیکھ کر افسروں کا تقرر کرتی۔ تو یہ مصیبت کیوں نازل ہوتی۔ یہ گنے چنے افسر تو اونٹ کی داڑھ میں زیرہ بن کر رہ گئے۔ جس نے اونچی بولی لگائی وہی لے اڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گریجویٹ اور تعلیم یافتہ لڑکیوں کی کثیر تعداد اس انتظار میں کہ کب گورنمنٹ آفیسر برسیں اور وہ سمیٹ لیں مختلف شعبوں میں نوکر ہو گئیں۔ اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ افسروں کی تعداد کم رہی تو کلرک بدقسمت اسکول ماسٹر ناکام اور اجڑے ہوئے ڈاکٹر نہیں پیدا ہوئے۔ وہ تو اور بھی شدت سے پیدا ہوئے۔ اب ان بے چاروں کے پاس دو راستے رہ گئے۔ یا تو جاہل لڑکیوں سے نصیبہ پھوڑ لیں۔ یا ایر اور تعلیم یافتہ لڑکیوں سے تخیلی عشق کر کے زندگی ان کی یاد میں گذار دیں، جنہوں نے دل پر پتھر رکھ کر سر پھوڑ لیا، ان کی روحیں بھی جیون ساتھی کی تلاش میں بھٹکا کیں۔ زندگی بھر ہم خیال ہم مذاق بیوی کا ارمان دل میں کچوکے مارتا رہا اور جو زیادہ ہمت والے تھے۔ وہ پاس پڑوس کی کبھی کبھی نظر آجانے والی پٹھو ڈیٹ حسینہ کی آگ میں سلگنے لگے۔

آخر الذکر تعداد میں زیادہ بڑھے اور نتیجہ یہ ہوا کہ عورتیں اور مرد پیدا ہوتے گئے اور دنیا میں رہتے رہے۔ ایک دوسرے کے لئے نہیں بلکہ "موزوں رشتہ" کے لئے بالکل جیسے ایک دکان میں کپڑوں کے گٹھڑ پڑے سڑ گل رہے ہوں، اور دوسری طرف سڑکوں پر ننگے گھوم رہے ہیں، ایک ہوٹل میں باسی مٹھائیوں اور کھانوں کے انبار موریوں میں لنڈھائے جا رہے ہیں اور دوسری طرف

لوگ فاقوں سے مر رہے ہیں، جوں جوں دکانیں اور ہوٹل لوازمات سے بھرتے جاتے ہیں ہاسرنوں پر ننگے اور بھوکوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ اسی طرح ایک پنجرے میں لڑکے اور دوسرے میں لڑکیاں بند کر کے بیچ میں چال چلن کے پہریدار بٹھا دیے گئے۔ لڑکیاں کنواری بیٹھی سوکھ گئیں۔ ادھر لڑکے حیوان بنتے چلے گئے، نتیجہ یہ کہ انسانیت زیادہ بھوکی مفلوج اور غیر انسانی بنتی گئی اور پھر ایک ایسا طبقہ پیدا ہوا جو برسوں کی چھپی ڈھکی غلاظتوں کے مواد کی طرح پھوٹ پڑا، اس نے جو پہلا کام کیا۔ وہ تخریب تھا۔ بوڑھے گھنے ہوئے پیڑ کا تنا اکھاڑے بغیر نیا پودا لگانا دشوار ہے پرانے مکان کو ڈھا کر ہی نئی کوٹھیاں بنائی جا سکتی ہیں۔ سب سے پہلے تو عورت اور مرد کے بیچ میں جو پاسبان بیٹھا تھا۔ اس سے مڈبھیڑ ہوئی۔ چونکہ بغیر عورت کے دنیا ادھوری تھی۔ گھر میں اپنی کمائی سے عورت رکھنے کی نہ ہی اقتصادی حالت نے اجازت دی اور نہ پاسبانوں نے۔ لاچار ہو کر وہ واپس طوائف کی آغوش میں جا گرا۔

گرہست ہیروئن کے راج میں طوائف مٹ مٹا کر خاک ہو چکی تھی۔ ناقدری اور پھٹکار نے اسے سورت سے بے صورت کر دیا تھا۔ کچھ دیوالیہ ہو کر نکاح کر بیٹھی تھیں۔ کچھ لمبی چوڑی دکانیں لٹا کر گندی نالیوں کے پاس خوانچہ لگا چکی تھیں۔ کچھ نے روپ بدل ڈالا تھا اور جیسے طوائف ہیروئن سے مرد کو چھینٹے کے لئے گرہستن نے گھونگھٹ اٹھایا تھا۔ آج اس نے اسی بھینکے ہوئے آنچل میں منہ چھپانے کی کوشش کی تھی، کبھی گرہستن نے اس کے ہتھکنڈے اور بناؤ سنگھار چھینے تھے آج اس نے گرہستن کی بیچارگی اور بیکسی کی آڑ لے لی اور سوائے بالکل نچلے طبقہ کے طوائف کو پہچاننا بھی دشوار ہو گیا تھا۔ اور جب یہ دماغی طبقہ طوائف کی تلاش میں نکلا تو

اس کی حالت زار دیکھ کر اس کا جی دہل گیا۔ طوائف اب وہ سرشار کی چہکتی ہوئی بلبل نہیں رہی تھی۔ بلکہ بھوکی کینی بلی بن گئی تھی۔ سوائے فقیروں اور یکہ تانگہ والوں اور مزدوروں کے کسی کو اس کا نام و نشان بھی معلوم نہ رہا تھا۔ اپنا مطلب تھا تو اسی طوائف کو سہروں میں پرو ڈالا۔ قصیدوں میں گوندھ کر لوگوں میں سجا کر ادب کو اس کی کونڈی بنا دیا اور پھر جو بھولے تو ایسا بھولے کہ لوٹ کر خبر بھی نہ لی۔ گھر میں نل لگ گیا تو میٹھے پانی کی کوئیوں کو ایسا فراموش کیا کہ اندھی ہو کر سانپوں اور کنکھجوروں کا مسکن گئی اور اب وقت پڑا اسی کے کنارے پیاسی زبانیں لٹکائے ہانپ رہے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ میونسپلٹی سے کہہ کر صفائی کرانے پر تلے ہوئے ہیں۔ مگر یہ اندھا کنواں دوبارہ کارآمد ہونے سے پہلے بڑی سخت مدد کا طالب تھا۔ چنانچہ باغی طبقہ اس کی حمایت میں چیخ پڑا۔ پکار پکار کر اس نے دنیا کے اس زخم کو دکھایا جو ناسور بن کر بج بجا اٹھا تھا۔ غریب مگر خود دار جوان اس طبقے کی حفاظت کو اٹھ کھڑا ہوا جو اس کی تھی۔ اس کے کام آسکتی تھی۔ اسے سارا حسن اور تمام لطافتیں اس ٹکھیائی اور فقیرنی میں نظر آئیں جس میں دنیا بھر کی غلاظتیں جذب ہو چکی تھیں مگر جو اسے مل سکتی تھی۔ ناقدری کی وجہ سے وہ گر گئی تھی اور اسی کے کرم کی محتاج تھی۔ شریف عورت اس نوجوان کی زندگی سے دور تر ہوتی گئی۔ وہ اس کے بارے میں نہ کچھ جان سکا اور نہ اس نے جاننے کی کوشش کی۔ اس کی نظروں میں وہ حرف تک چڑھی۔ خود غرض اور چھوٹی مخلوق بن کر رہ گئی جو پیار بھری نظروں کو گالی اور عشق کو گھناونا سمجھتی ہے۔ جو محبت کرنا ہتک سمجھتی ہے۔ اور مرد کی حفاظت اپنی تو ہیں اس میں عام طوائف جیسی گندھی بھیانک جاذبیت کہاں؟ عام طوائف سے وہ طوائف مراد

نہیں جو بڑے آدمیوں کی دنیا میں چمکا کرتی ہے بلکہ سڑک کی وہ ننگی بھوکی کتیا جو راہ چلتے کی ٹانگ پکڑ کر گھسیٹتی ہے۔ جو ہر قیمت پر ہر حیثیت کے انسان کو لنگر بانٹتی ہے۔ اس کی گندگی اور غلاظت گھن کھانے کی چیز نہیں بلکہ اصلاح کی محتاج ہے۔ اگر ہمارے مکان میں نالی سڑ رہی ہے۔ تو یہ اس بیچاری نالی کا قصور نہیں بلکہ مکان دار کا قصور ہے۔ اسے گندہ کہہ کر منہ موڑ لینے سے گندگی دور نہیں ہو جائے گی، طوائف گندی اور بیمار، کمینی اور جعلساز ہے تو یہ اس کا قصور نہیں بلکہ نظام کا قصور ہے۔ جو انسانیت کی یوں بیقدری کرتا ہے۔ نئے ادیبوں نے طوائفوں کا حال لکھ کر بیشک ایک متعفن پھوڑے کا منہ کھول دیا جس نے نازک مزاج لوگوں کی لطیف طبیعتوں پر برا اثر ڈالا۔ مگر اس پھوڑے کا مواد نکل جانے سے دنیا کے تھوڑے بہت دکھ مٹ جانے کا امکان پیدا ہو گیا۔ طوائف کیسی بھی ذلیل ہو ہماری دنیا کے جسم کا ایک حصہ ہے۔ اسے سڑا کر نہیں پھینکا جا سکتا۔ لوگ اسے عورت نہیں مانتے۔ وہ جو دنیا کے ہر دکھیارے کا سہارا ہر بھوکے کا دستر خوان ہے۔ وہ بے شک عورت نہیں مگر اس سے بھی زیادہ کارآمد ہستی ہے یہی وجہ ہے کہ آجکل کا نوجوان گرہستن سے زیادہ بازاری ماں کی بہتری کا خواہاں ہے۔ وہ اس کی زندگی سے دور اور یہ قریب ہے۔ اسے کیا غرض جو تعلیم نسواں نہیں ہو رہی یا بیوائیں بن بیاہی سوکھ رہی ہیں، یا میاں بیویوں کی ناکیں کاٹے ڈال رہے ہیں، اس کی بلا سے دنیا بھر بیوہ ہو جائے اور عورت ٹٹے یار ہے۔ دیکھئے! آپ کے محلے کی نالی خراب ہو جاتی ہے۔ تو آپ غل مچا دیتے ہیں اور آپ بھر وابھی نہیں کرتے کہ اس سال لڑائی کی وجہ سے وکٹوریہ گارڈن میں عمدہ بیج

نہ بوئے جا سکے۔ اس لئے اس سال تختہ گل کی بہار سے لوگ محروم رہ جائیں گے۔ آپ کی بلا سے پھول کھلیں یا نہ کھلیں مگر مالی ضرور صاف ہونی چاہیے۔

اب خواہ دنیا موجودہ ادب کی ہیروئن کو ناپاک، عریاں اور مکروہ کہے زمانے نے اسے ہیروئن کا رتبہ دے دیا۔ یہ زمانے کی نشیب و فراز کی ڈھالی ہوئی اینٹ ہے جو تعمیر میں اپنی جگہ پا گئی۔

تو یہ ہوئی ہیروئن، سرشار کی ناز و ادا بھری نازنین، جسے دنیا میں سوائے کھانے پینے اور عیش کرنے کی کسی بات کی فکر نہیں تھا۔۔۔ بس نے غلط کہا، ایک بات کی بے انتہا فکر ہے۔ اور وہ عشق لڑانے کی۔ یہ زمانہ ہے۔ فارغ البالی کا، پھر اس کے مقابلے میں پریم چند کی مظلوم عورت اور ارشد الخیری کی کچلی ہوئی بیوہ، یہ زمانہ ہے اقتصادی کش مکش کا اور سدھار کا۔ پھر لیجئے مزاح نگاروں کو۔۔۔ یہ ہنس گئے اور ہنسا گئے۔ چرخی میں مگن، نہ آگے جانا نہ پیچھے ہٹنا۔ پھر ایم اسلم کی سادھو کی لڑکی جسے سوائے ندی کے کنارے آنے جانے والوں سے پریم کی پینگیں بڑھانے اور بھونروں کے ساتھ گیت گانے کے اور کوئی کام نہیں۔ مس حجاب کی بیوقوف، کاہل اور بے مصرف دوشیزہ جسے سوائے چوہوں سے ڈر کر بیہوش ہو جانے کے اور کچھ نہیں آتا، جہاں حسن و عشق کو بناوٹ نے الو بنا رکھا ہے۔ یہ زمانہ ہے۔ حاجز آ کر اونگھنے کا، اور پھر کرشن کی زندہ عورت، بیدی کی کاروباری ہیروئن منٹو کی جلینی جانگی سب کی جانب پہچانی بے حیا رنڈی۔ عصمت کی بے چین، منہ پھٹ اور بے شرم لڑکی۔ ستیارتھی کی خانہ بدوش عسکری کی فلسفی میم صاحب۔۔۔ یہ زمانہ ہے زندہ رہنے کے لئے لڑ مرنے کا۔ کچھ تعمیر کرنے کے لئے جد و جہد کا۔ کچھ مٹانے کیلئے

اور کچھ بنانے کے لئے دین و دنیا کو تلپٹ کر دینے کا۔ جیساکہ موجودہ فضا سے ظاہر ہو رہا ہے۔

اب دیکھنا ہے کہ ہماری آئندہ زندگی کی ہیروئن کس شان سے جلوہ افروز ہوتی ہے۔ خدا کے بعد عورت ہی کی پرستش ادب میں کی گئی ہے۔ یا شاید اس کا نمبر پہلے آتا ہے۔ اور پھر دنیا کی دوسری طاقتوں کا جہاں تک اندازہ کیا جاتا ہے۔ آنے والی ہیروئن نہ تو ظالم ہوگی نہ مظلوم۔ بلکہ صرف ایک عورت ہوگی اور اہرمن و یزداں کے بجائے ادیب اسے عورت کا رتبہ ہی بخشیں گے اور پھر تعمیر شروع ہو گی۔

بیڑیاں

"توبہ ہے تمہاری قبر آپا — لاحول ولاقوۃ —" وحید نے اچھا بھلا لمبا سگریٹ پھینک کر دوسرا سلگا لیا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو جمیلہ اس سے بری طرح لڑتی۔ اسے یہی برا لگتا تھا کہ سگریٹ سلگا لی جائے اور پی نہ جلے بلکہ باتیں کی جائیں۔ جب سلگائی ہے۔ تو پیو۔ دھواں بنا کر اڑا دینے سے فائدہ مفت کی تو آتی نہیں۔ مگر اس وقت وہ ہنسی کو دباتے میں ایسی مشغول تھیں کہ گھریلو اقتصادیات کا بالکل دھیان نہ رہا

"اوئی اللہ — کبری آپا سن لیں تو —"

"ہماری بلا سے سن لیں — چہ چہ — سراسر دھوکا — جبل یعنی ہم میہاں

پیاری سی چٹاخ پٹاخ سالی کے تخیل میں گھل رہے ہیں۔ یار دوستوں کو ادھ مرا کر دیا ہے ــــ رشک کے مارے، ہٹاؤ بھی نری وہ ہو تم،،

،، تو ــــ کیا آپ سمجھتے تھے۔ میں سچ مچ انہیں حسین کہتی تھی۔ یونہی ذرا آپ کو چھیڑنے کو کہہ دیا تھا۔ ہونہہ، بڑے آئے وہاں سے جیسے میری بہنیں ٹکیا بنیاں ہیں جو تم سے ٹھٹول کرنے آہی تو جائیں گی یہاں،،

،، ارے تو کیا حرج ہے۔ ٹھٹول میں ــــ کھا تو نہیں جاؤں گا بابا۔ ایسا تمہیں کیا نگل لیا جو ــ تمہاری ان قبر۔۔۔،،

،، ہوش میں ذرا ــــ اترائے ہی چلے جا رہے ہیں،،

،، تو پھر کیوں دھوکا دیا ہوگا ــ،،

،، کس کمبخت نے دھوکا دیا آپ کو،، جمیلہ بنی ــ حالانکہ خوب جانتی تھی۔

،، ارے ہم سمجھتے تھے چلی آرہی ہو گی رس گلے جیسی میٹھی کوئی امنی سی سالی،،

،، چپ رہو جی ــ ہونہہ ــــ تو کیا برائی ہے ان میں ــ،،

،، کس میں! قبر آپا میں؟ کوئی نہیں بہترین جلتی قبر ہیں ــ ایسی کہ بس دیکھتے ہی مر جانے کو جی چاہے۔ قبر کی آغوش میں ــ واہ،،

،، میں کہتی ہوں کیا عیب ہے۔ ایسی کتارہ جیسی ناک ــــ اتنا سا دہانہ ــــ ہاں آنکھیں نہ بہت اچھی ہیں اور نہ بہت بری۔ مگر ناک نقشہ تو ــ،،

،، یہاں ناک نقشہ کون کمبخت ناپ رہا ہے ــــ اور کس کمبخت نے تم سے کہا کہ ہمیں کتارہ جیسی ناک چاہیے۔ ہم کہتے ہیں عورت کے چہرے پر ناک کی ضرورت نہیں۔ بیکار ہی حارج ہوتی ہے۔

"توبہ! کیسے برے ہیں آپ!"

"اور کیا! یہی تو تم میں خوبی ہے کہ ناک۔۔۔"

"اوئی یہ چیاں جیسی ناک کمبخت ۔ میری ناک بھی کوئی ناک ہے۔"

"بس ٹھیک ہے۔ اور نہیں تو کیا پھاوڑے سے برابر ہوتی، مگر بابا ۔ تمہاری بیچاری بہن ۔ انہیں تو صفابات ہے کچھ۔۔۔"

"ہٹئے بڑے آئے بیچاری کہنے والے"۔۔۔۔

"سوکھی ہڑ! اچھا توبہ ۔ انہیں تو"۔

"کیا؟" جمیلہ شوق سے آگے جھک گئی

"یہی ۔ کہ کیا ہو گیا ان بیچاری کو؟ معلوم ہوتا ہے پڑے پڑے دیمک لگ گئی"۔

"چھ ۔ کوئی نہیں۔ صحت اچھی نہیں رہتی۔ رنگت جل گئی۔ رنگ ایسا انار کا دانہ تھا کہ کیا بتاؤں"۔

"اجی کبھی ہو گا اگلے وقتوں میں ۔ اب تو بس نری قبر رہ گئی ہیں اور وہ بھی گھنی گھنائی ۔"

"تو کوئی ایسی اتنی زیادہ عمر تھوڑی ہے"۔

"نہ ہو گی مگر معلوم ہوتا ہے۔ ڈال میں لٹکے لٹکے نچڑ گئیں۔ کوئل نے ٹھونگ ماردی شاید" ۔

"ہائے اللہ۔ چپ رہیے ۔ کیا گندی زبان ہے کمبخت!"

"میں کہتا ہوں ایک سرے سے عورت ہی نہیں ۔"

"ایں ؟ — واہ . . . ا —"

"ہاں — شرط بدلو، اُوں — ہجرطہ میں — تمہاری کبری آپا —"

"ہائے توبہ — آپ نہیں مانیں گے"

"خدا قسم — سچ کہتا ہوں سونگھ کے بتا سکتا ہوں کہ . . ."

"میں نہیں سنتی — میں نہیں —" جمیلہ کانوں میں انگلیاں ڈال کر چلانے لگی۔

"سچ — قبر میں پوری — اور ہمیں قبر سے ڈر لگتا ہے" —

"میں رو دوں گی" کہنے سے پہلے ہی جمیلہ نے موٹے موٹے آنسو بہانا شروع کیے۔"

"ارے رے رے — رو دیں اچھا نہیں نہیں — ہماری جمو — بچ — ہماری جمو بٹیا —"

"پھر — پھر آپ نے مجھے بیٹی کہا۔ پتہ ہے یہ گالی ہے۔" جمیلہ آنسوؤں کی لڑیاں بکھیرتی ہوئی دہشت زدہ ہو کر چلاتی۔

"ایں ؟ گالی — کیسی گالی — بٹیا نہیں ٹبیا سہی۔ کیوں بٹیا تو پسند ہے بٹیا چاہیے ؟"

"ہائے اللہ میں —"

"رو دوں گی" وحید نے نقل کی۔

"مذاق کی حد ہوتی ہے۔ ایک۔ کتنی دفعہ کہہ چکی ہوں کہ نکاح ٹوٹ جاتا ہے۔ بیٹی ماں یا بہن کہہ دینے سے"

"ارے! — یہ بات ہے اور تم نے ہمیں پہلے سے بتایا بھی نہیں"، وحید فکرمند ہوگیا "اب پھر سے نکاح کرنا ہوگا — چلو — چلو اٹھو"۔

"میں — میں تو مرجاؤں اللہ کرے۔ نہیں جاتی — ہٹئے"۔

"اچھا تو پھر یہیں سہی"۔

"ہائے"! اچک کر جمیلہ بھاگی۔ اس سے قبل کہ وحید اٹھے وہ چبوترے پر سے دھم سے کود باورچی خانہ میں جا چوکی پر پھسکڑا مار کر گر گئی۔

"ہے ہے نہیں سنتی نیک بخت — کدھر سر پیٹ کے نکل جاؤں۔ میرے اللہ"! ملانی بی نے سروتہ چھوڑ کر پوری طاقت سے ماتھے پر ہتھیلی ماری پریشان بال، کاندھوں پر دوپٹہ۔ جیسے الگنی پر سکھانے کے لئے ڈال دیا ہو، گال دہکتے آنکھیں آنسوؤں میں نہائی مگر ہونٹ مسکراہٹ میں مچلتے ہوئے — جمیلہ نے لاپرواہی سے چمٹا اٹھا کر چولہے کی راکھ بکھر دی جلن تھی اسے ملانی کی لکچر بازی سے۔ جدھر جاؤ نصیحتوں کی پوٹلیاں ساتھ! سارے گھر کی زنانی پود کی خدا ئے مجازی سمجھو۔ جب تک زچہ کی پٹی پر پیٹ پکڑ کر نہ بیٹھیں تو نئی روح کی مجال نہیں جو دنیا میں پر بھی مار سکے۔ کنواری بیاہی سب ہی کے مرحلے چٹکیوں میں طے کرا دیتیں، ممکن نہیں جو کوئی کیس بگڑ جائے۔ لڑکی بالیوں کو اشارے کنایہ سے بہوؤں کے گھونگھٹ میں منہ ڈال کر اپنا سبق پڑھا ہی دیتیں جونہی کوئی امید سے ہوتی۔ ملانی بی اس کے گرد گھیرا ڈال پنجے گاڑ کر بیٹھ جاتیں۔

"ہے ہے بنو — اے دلہن —!" اللہ کا واسطہ یہ جہاز کا جہاز پلنگ گھسیٹ رہی ہو اور جو کچھ دشمنوں کو ہو گیا تو — سچ سچ میری لاڈلی کتنی

دفعہ کہا کنواری بیاہی ایک سماں نہیں۔ بنّو وہ دولتیاں اچھالنے کے دن گئے سے۔ بیٹی جان پندرا سنبھال کے جیٹھا گھڑا سمجھو، ٹھیس لگی اور لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔

مگر جتنے جتنے پہرے لگائے جاتے، اتنے ہی چنچے گھرلوں کی دراڑیں چوڑی ہوتی جاتیں، آج اس کے پیچ ڈھیلے تو کل اس کی کلیس خراب۔ آج ایک کے تلے اینٹھے تو کل دوسری کی ناف غائب! توبہ! کیا گھناؤنی چپچپاتی زندگی ہے۔ کہ آئے دن کو ٹھڑیوں میں تیل کڑکڑائے جارہے ہیں۔ بساندی چھچھاندی جیز بس جل رہی ہیں۔ مالشوں کے گھسے جل رہے ہیں لیپ بندھ رہے ہیں۔ کیا کمبخت عورتوں کے مرض بھی مگر مردوں کو کون سے کم روگ لگتے ہیں؟ نہ بچے جنہیں نہ خون چھپائیں، پھر اللہ مارے کیوں رنجے جاتے ہیں۔ ایک سے ایک لاجواب بیماری پیٹے پڑے ہیں۔ دواخانے سے دواؤں سے کیسا جی کڑھتا ہے مگر جمیلہ کو تو ہیر تھا ملانی بی سے کنوار پنے میں تو خیر اس نے سنا ہی نہیں ان کا کہنا مگر یہاں بھی اماں جان نے لاڈلی کی جان کو روگ کی طرح سائے لگا دیا تھا، کمبخت اٹھتے بیٹھتے ٹوکے ہی دیتیں مگر وہ انہیں چلانے کو دھما دھم کودتی۔ ایک سپاٹے میں زینے سے اتراتی خوب احاطے میں سائیکل چلاتی، رسی پھلانگتی اور ملانی بی سینہ کوب لیتیں۔ وئید سے شکایت کرتیں — وہ ادرشہ دیتا اور جب ایک محاذ پر انہیں شکست ہوجاتی تو دوسری طرف رخ کر کے حملہ کرتیں۔ یہ ان کی عادت تھی۔

ہمارے ہنو یہی تو دن ہیں اوڑھنے پہننے کے — کب سنو ہو تم — وہ سمجھاتیں۔

"بھئی ہمارا جی بولاتا ہے"۔ کس قدر جاہل تھیں ملانی بی — بھلا جب تک گال چمکتے ہوں اور بانہیں گدگدی ہوں تو حماقت ہے زیور لادنا۔ یہ لیپا پوتی تو جب ضروری ہوتی ہے جب عمارت ذرا دوچار برساتیں جھیل کر کچھ ادھر سے ٹپکنے لگے کچھ ادھر سے جھک جائے مگر ملانی بی کب مانتی تھیں۔ ان کا فلسفہ ہی دوسرا تھا۔ جونے سے پہلے ہی کیوں نہ قلعی لگا دو برتن! عقلمندی!

"اے بیگم دم بولاتا ہے! کوئی تم ہی نرالی ہو نہیں — خیر ہمارا کیا آپ ہی ترسوگی"۔

"کیوں ترسوں گی۔ جب جی چاہے گا پہن لوں گی"۔

"ارے چاند میرے جب بیڑیاں پڑ جائیں گی تو پھر جی بھی نہ چاہے گا"۔

"بیڑیاں؟"

"ہاں اور کیا۔ بیڑیاں ہی ہو ویں ہیں — اب اللہ رکھے، گوں محنت کرو گی کہ گہنا پاتا کرو گی"۔

توبہ! کیا زبان ہے ملانی بی کی جیسے کیچڑ بھری نالی۔ اور ساتھ ساتھ کیا لفنگوں جیسی آنکھیں بناتی تھیں کہ اچھا بھلا انسان جھینپ کے رہ جائے۔ اٹھتے بیٹھتے بس یہی ایک دعا تھی۔ اللہ گود ہری بھری رکھے! بڈیا ہو! گود بھرتے وقت جو سمدھنوں نے اسے دودھوں نہانے اور پوتوں پھلنے کی دعا دینا شروع کی تو یہ دن ہو گیا۔ کسی سلام کا جواب ڈھنگ کا نہیں ملتا، وہی مرغے کی ایک ٹانگ۔ جھٹ پٹ، بچہ دو۔

سانس لینا دشوار ہے۔ ادھر سہرے کے پھول کھلے اور ادھر کھٹاک سے

پھل لگا اور پھر جو لگی آم کے پیڑ جیسی پھلدار، کبھی بور، کبھی امیاں اور کبھی پت جھڑ!

وہ ایک جھپاکے سے وہاں سے بھاگی — اور سہم کر وحید کی آغوش میں چھپ گئی۔ وہ اس کا طرفدار تھا۔ شادی کرتا ہے انسان شوہر کے لئے ورنہ بچے تو ویسے بھی مل سکتے ہیں اور پھر یوں بھی جب چاہو، جب انسان ہی کیا کتے، بلی، بندر جس کے بچے کو چاہو دم کے ساتھ لگا لو، دم بن جائیگا اور پھر یہی چند مہینوں کی بات ہوتی تو اور بات تھی۔ وہاں تو ساری عمر کے رے گھستے اور دھونیاں لو، اور اوپر سے پلے کی پیاؤں پیاؤں!

اندھیرے میں اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر راستہ ڈھونڈنا چاہا مگر چکرا کر گر پڑی، وہ کانوں تک دھنسی ہوئی روئی کے ریشوں برابر انسانی کیڑوں کی دلدل میں دھنس گئی۔ دیکھتے دیکھتے اس کے جسم کی جاگیر پر لیٹرے ٹوٹ پڑے اور اس کے وجود کو دیمک کی طرح چاٹ لیا۔ دو چار جوؤں کی طرح بالوں میں قلابازیاں لگانے لگے۔ چند ایڑیاں دھمکاتے اس کی موتی جیسی آنکھوں کی جلد کو کھرچنے لگے دو چار ہتھوڑیاں لے کر دانتوں کا کھلیان کر دیا اور دم بھر میں بھرا ہوا مٹہ کھنڈر بن گیا۔ بڑے بڑے آہنی اوزار چلا کر انہوں نے اس کی ریڑھ کی ہڈی کی ایک ایک گرہ جھنجھوڑ ڈالی اور وہ پچکی ہوئی مشک کی طرح نیچے بیٹھ گئی۔

اس کے ہاتھ بے ست ہو گئے جیسے بجھی ہوئی لکڑیاں! وہ لمبی ناگن جیسی چوٹی کوڑھ ماری چھپکلی بن گئی۔ وہ گدانہ بازو جن پر وحید شرارت سے پینسل ڈال کر انہیں سنگ مرمر سے تشبیہہ دیا کرتا تھا۔ وہ گدگدی کے خوف سے بے چین

پاؤں جنہیں وہ ڈر کر شلوار کے پائنچوں میں چھپا لیا کرتی تھی اس کی دولت جس کے دبدبے سے وہ وحید کے دل و دماغ پر راج کرتی تھی نیچے ڈھے گئی جیسے طوفان اور آندھی کے زور کے آگے کچا مکان!

وحید! اس کا وحید تو تھا، چلا چلا کر وہ اسے پکارنے لگی، جونکوں کا چوسا ہوا پھوک زنگیائی ہوئی ہڈیاں اور سکڑی ہوئی کھال کی پوری طاقتیں لگا کر اس نے وحید کو پکارا، اس کا حلق بیٹھا ہوا تھا مگر آواز نہ تھی۔ اس جم غفیر کے غل میں اس کی ہر چیخ فنا ہو گئی۔ وہ ابھی موجود تھے ۔ اس کا جسم اور روح نچوڑ لینے کے بعد وہ ہاتھوں میں لمبی لمبی جھاڑ دیں اور ہونٹوں پر مسرت بھری شکار یاں لئے صفایا کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ چشم زدن میں اس کے جہیز کے جھلملاتے جوڑے جو اس نے دم بولانے کے ڈر سے نہیں پہنے تھے ۔ آنکھوں کو خیرہ کرنے والے زیور لمبے جھمکے اور بالے انگوٹھیاں اور چندن ہار۔ اس کے چینی کے سیٹ اور چاندی کے ظروف ان لمبی جھاڑ دوں کے لمبے سپاٹوں میں لپٹے دور بہتے چلے جا رہے تھے ..... وحید! ..... اس نے پھر پکارا اور پھر اپنے سے دور اس نے اسے باد مخالف سے لڑتے ہوئے پایا ۔ لنڈ منڈ تنہا درخت کی طرح وہ اداس اور جھکا ہوا تھا۔ اس کا چوڑے سینے والا جوان شوہر ۔ وہ چیخ مار کر لپٹ گئی

"وحید ۔ وحید"

"کیا ہے جمیلہ" ۔ وحید نے جواب دیا۔ مگر وہ اس کے سینے سے لگی چیختی رہی۔

"کیا خواب میں ڈر گئی جمو! وحید نے اسے سمیٹ کر قریب کر لیا۔

اور صبح سے اسے کسی نے ہنستے نہ دیکھا، وہ خاموش اور ڈری ہوئی کسی نامعلوم حادثے کے انتظار میں لرزاں تھی، اس کا رنگ پیلا ہو گیا تھا۔ جیسے پڑے پڑے دیمک چاٹ رہی ہو۔ اس نے اپنا چالے کا بھاری پوتھ کا پاجامہ پہن ڈالا۔ جیسے وہ اسے چور اچکوں سے بچا ڈالنا چاہتی ہو۔ مگر اس کی نگاہوں کی تھکی ہوئی اداسی اور مردنی نہ گئی۔ چلتے چلتے ایک دم وہ زور زور سے پیر پٹخنے لگتی، گویا کوئی بھاری سی لوہے کی رکاوٹ جھاڑ پھینکنا چاہتی ہو۔

اسے وحید کے مذاق پر رونا آنے لگا۔ اور جب اس نے صرف اسے ہنسانے کے لئے قبر کی آغوش میں سو جانے کی دھمکی دی تو وہ بدمزاج چڑیلوں کی طرح اس کی جان کو آ گئی۔ اس نے صاف صاف گالیاں اور ذلیل کوسنے دینا شروع کر دیئے کہ واقعی کبری آپا پر عاشق ہے۔ اور اسے کبری آپا سے ایسی نفرت ہو گئی کہ حد نہیں۔ وہ مشتبہ نظروں سے ہر وقت انہیں ایک مختصر گھیرے میں لپیٹے تاکا کرتی۔ ان کے ہر فعل پر دل دھڑکاتی۔ وحید بھونچکا اسے دیکھا کرتا اور وہ ڈائنوں جیسے خوفناک حملے بکا کرتی۔ اس کا مزاج اور بگڑا، یہاں تک کہ رات کی نیند اور دل کا چین غائب ہو گیا۔ گھنٹوں کسی غیر انسانی طاقت سے سہمی ہوئی وہ خاموش آنسو بہایا کرتی۔

ایک بار اس نے اپنے سب جوڑے باری باری نکالے۔ وہ چست پھنسی ہوئی صدریاں، تنگ کمر کے کرتے، فلیش ایبل جمپر سب دیکھے اور ٹھنڈی سانسیں بھر کر رکھ دیئے۔ کپڑوں کے صندوق کو قبر کے پٹ کی طرح بھڑ کر وہ خاموش رو پائی۔ اسے اور بھی چپ لگ گئی۔

مگر پھر اس نے ایک جھٹکا مارا اور چھنا چھن کرتی، آہنی زنجیریں دور بکھر گئیں — قہقہہ مارتی، کھلکھلاتی ہوئی جمیلہ موت سے کشتیاں لڑنے لگی۔ ملانی بی نے سر کوٹ لیا۔ بیگم صاحب چونڈا نہ مونڈ دیں — ہا! بچاری کے صدیوں کے تجربے پر پانی پھر گیا — اور جمیلہ!

دیکھتے ہی دیکھتے وہ ہلکی پھلکی تیتری کی طرح ہوا میں تحلیل ہو گئی!

پلیتہ

مجھے معلوم تھا۔ وہ سوبٹا سو طوائف ہیں۔ وہ سرخ مصنوعی بال، چست کپڑے اور دن رات مردوں کے ٹھٹ۔ ناچ گانے اور موٹے مہین قہقہے۔ مجھے اپنے کمرے میں بیٹھے بٹھائے جھکولا کرتے تھے۔ ہم عورتیں بڑے سے بڑے پہلوانوں کو چت کر سکتی ہیں پر جب طوائف سے ٹکر ہوتی ہے تو ساری نسوانیت اپنا سا منہ لے کر رہ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماں لوری کے ساتھ ساتھ بچے کے دل میں یہ بات چپکا دیتی ہے کہ طوائف اژدہا ہے۔ سانپ ہے! کیا کچھ ہے۔

اور یہی بچپن کی نفرت اب تک خون کے ذروں میں ناچ رہی ہے ویسے ہزاروں عورتیں گزر جائیں، پتہ نہیں چلتا۔ لیکن طوائف کو سونگھ کر ہرن کی طرح بھڑک جاتی ہوں، مجھے یاد ہے کہ یہ خوشبو پہلی دفعہ میں نے بہت بچپن میں سونگھی تھی۔ بھرائچ میں سید میاں کے مزار پر جمعرات کو طوائفوں کا جمگٹھا ہوتا اللہ کے پیارے بھی اس متبرک دن کچھ زیادہ ہی آجاتے، ایک دن ایک پکی سی طوائف نے مجھے نہ جانے کس جذبہ کے تحت گود میں اٹھا لیا۔ وہ اس کے پھسلتے کپڑے اور مخصوص خوشبو میں بسا ہوا سینہ! میں جلدی سے اس کی گود سے مچل آئی۔

اس دن مجھے سب نے خوب تھو تھو کر کے چھیڑا کہ ہے بچاری کو رنڈی نے چھو لیا اور میں بھی اس ہتک کے احساس سے دیر تک روتی رہی، پھر ایک دن

میری پھوپھی آئیں اور انہوں نے مجھے پیار کیا تو وہی پھسلتے ہوئے ریشمی کپڑے اور مہکتا ہوا سینہ! نہ جانے کیوں میں فوراً مچل کر بھاگ آئی۔ میرا اندازہ ٹھیک نکلا اور میری رنگین پھوپھی مشکل سے مہینہ بھر رہی ہوں گی کہ دس بچوں کے باپ میرے ابا جان ان پر بری طرح عاشق ہو گئے۔ میری اماں بچاری بجھ کر رہ گئیں۔ بھلا پان بیڑی کی دکان کے سامنے کوئی شاندار ہوٹل کھول دے تو بچاری دکان کا جوبن کے دن کا! خیر ٹونے ٹوٹکے ہوئے، تب جا کر کہیں ان کے گردوں میں درد اٹھا اور وہ بھاگیں، ہاں تو میرا مطلب یہ ہے کہ ہم عورتیں طوائفوں کو سونگھ کر رہی کھٹک جاتی ہیں، بقول کسے ان کا ٹھسا دیکھ کر ہی حفاظتی دیواریں کھڑی کرنے کو دل چاہتا ہے۔ وہ کوٹھے سے اتر رہی تھیں اور میں چڑھ رہی تھی کہ میں نے انہیں سونگھ لیا۔ اے ہے یہ میں کہاں آگئی؟ کیا کہے گی دنیا! میرے محکمہ والے کیا کہیں گے؟ ایک سے ایک بدمزاج بھرا پڑا ہے۔ محلہ والیوں سے زیادہ یہ محکمہ والے ایسی ویسی باتوں کے پیچھے لگے رہتے ہیں۔

عید کا دن تھا۔ غریبی میں کیسی عید اور کیسا محرم۔ کپڑے بھی نہ بدلے اینٹھی اخبار دیکھتی رہی۔ پڑوسن کے یہاں چار بجے سے برتن کھڑک رہے تھے، ان بچاریوں کو نیاز نذر کی بڑی فکر پڑی رہتی۔ بستر پر لیٹی ناشتہ کر رہی تھی کہ دروازہ کھٹکھٹایا اور قبل اس کے کہ میں سنبھلوں وہ اُن دھمکیں!

عام طور پر کسے معلوم رہتا ہے۔ کہ کیا ہونے والا ہے اور میری عمر میں یہ پہلا موقع تھا کہ کوئی طوائف دندناتی چلی آئی ہو۔ لہٰذا میں گھبرا کر رہ گئی۔

"اے ہے میں نے کہا کہیں تم ناشتہ نہ کر چکو۔ کیا سٹم پٹم سویاں

بگھاری ہیں"۔ وہ اپنے چست کپڑوں میں سے پھنکاریں۔ کمبخت کو یہ بھی سوچنے کی فرصت نہ تھی کہ تنگ کپڑے پہننے کے دن کبھی کے جا چکے تھے اور خمیری آٹے کو تسموں سے کسنے سے نہایت ناہموار سطح ہو جاتی ہے۔

"میں صبح کے وقت مٹھاس نہیں کھاتی"۔ میں نے غرور سے گرہستن بننے کی کوشش کی۔

"اوئی آج عید کے دن بھی مٹھاس نہیں — بھئی تمہیں ہماری قسم تھوڑی سی ضرور چکھو"۔ وہ نہایت بے تکلفی سے پلنگ پر بیٹھ گئیں۔

یا اللہ! کیا یہ مجھے بھی طوائف سمجھ کر تبرک کے ذریعہ میرے گناہ دھونے آئی تھیں۔ اب یہ کیسے بتاؤں کہ میں قطعی نیک اور پارسا ہوں اور پھر قسم! اوہ معبود یہ وہی تو اس کے ہزاروں عاشقوں کی بچھڑی ہوئی قسم تھی جو یہ میرے حلق میں ٹھونس رہی تھی! میں جل اٹھی۔ لیکن جب وہ بے حیائی سے مصر ہی ہو گئیں تو میں نے دو چمچے چکھ لئے۔

"باورچی نے کہا کہ یہ بیوی مسلمان ہیں — بس میرا جی ملنے کو پھڑک رہا تھا۔ مگر تم تو سارا دن غائب رہتی ہو"۔ کسی نے انہیں پکارا اور وہ چلی گئیں۔

میں نے دو چمچے اور کھائے! یا خدا! جی چاہا حلق میں انگلی ڈال کر قے کر دوں یہ مجھے کیا ہو گیا تھا۔ میں طوائف کی کمائی کھا رہی تھی۔ عصمت فروشی کی جمع کی ہوئی گھناؤنی دولت۔ فاحشہ بدکار کا پیشہ!

مگر پھر میرے دل میں نہایت بے شرمی کے باغیانہ خیالات ناچنے لگے یہ رنڈی کا پیشہ بھی تو اپنے باپ دادا ہی کا پیشہ ہے۔ میرے ایک چچا تھے، جنہوں

نے تین ہفتہ میں تیس ہزار روپیہ رنڈی بازی میں اڑا دیا تھا۔ اس سے مجھے کیا کہ میری پچی رنڈی کون تھی۔ ان لال بالوں والی ہی کی کوئی بہن بھانجی ہو گی میں نے اور شوق سے سویاں کھانی شروع کیں۔ جیسے میں پھینکا ہوا مال سمیٹ رہی تھی مجھے ایک قسم کا اطمینان سا حاصل رہا تھا۔ میں ایک امیر کو کچھ تھوڑا سا غریب بنا رہی تھی۔ ایک چمچہ اور لیا اور میرا منہ کیوڑہ اور میوہ میں گھلی ہوئی سویاں سے بھر گیا ایک بڑا سا سالم پستہ میری واڑھ کے نیچے کچ سے آگیا۔ چکنائی کی ننھی ننھی بوندیں منہ میں پھدکنے لگیں۔ جیسے میں نے کسی موٹے سے بنئے کو چبا ڈالا۔ مگر فوراً ہی مجھے اس کی چربی کے خیال سے ابکائی آگئی۔ مجھے وہی اطمینان محسوس ہو رہا تھا جو انگریزی کپڑے جلاتے وقت بلوائیوں کو ہوتا ہے۔ ہماری انتقام پسند آنکھیں ان خالی خولی کپڑوں میں اپنی مرضی کے موافق تخیلی جسم دیکھ کر سکون محسوس کرتی ہیں۔

میں نے سرہانے کی میز سے میٹرک کے امتحان کی کاپیاں اٹھا کر دیکھنا شروع کیں۔ کیسی عید اور کیسی بقر عید ابھی میں سو کاپیاں اور دیکھنا تھیں مگر میرا دماغ جب بھٹکنا شروع کر دیتا ہے۔ تو ہزار گھیروں پکڑ میں نہیں آتا، جل کر میں نے کئی بد قسمتوں کو فیل کر دیا۔ پھر کاپیاں دور پھینک کر انگڑائیاں لینے لگی۔ یہ یہاں کی آب و ہوا بھی کیا عجیب ہے۔ جیسے بڑے سے گیلے تولیہ میں فضا لپٹی اونگھ رہی ہے۔ تھکی تھکی نیند، اعضا بھاری اور پھسلنے۔ جیسے کسی نے سریش لگا کر ہلکا سا کھا دیا ہو۔ ایک جھلایا ہوا سرور سا۔ اور پھر پڑوسن کے یہاں سے قہقہوں کے گرم گرم بھبکے!

بد نصیب! مجھے پڑوسن پر رحم آنے لگا۔ ممکن ہے۔ غریب اپنا جوہر عصمت لٹانے پر مجبور ہو گئی ہو۔ شاید کسی ظالم نے اس کی عزت لوٹ لی ہو اور پھر وہ

کھسیا کر سر بازار بکھیرنے لگی اور مجھے اس پر پیار آ گیا، جب کبھی ہم سب بچے اماں سے کوئی کھانے پینے کی چیز چھیننے لگتے تو وہ بھی کھسیا کر ٹوکرے کا ٹوکرا پٹخ دیتی تھیں ـــ کہ لو نامرادو بھگتو ـــ آپ مرو گے ـــ !!

لیکن ہمیشہ نیک خیال کے ساتھ بد خیال ضرور میرے دماغ میں رینگ آیا کرتا ہے۔ اور جونہی بچارا نیک خیال اونگھا بد نے پھن اٹھایا۔ یقیناً یہ سرخ بالوں والی طوائف تو جان بوجھ کر شوقیہ بنی ہوگی۔ سستی کے مارے اور دنیا کا کچھ کام نہ ہو سکا ـــ مزے سے یہ پیشہ اختیار کر لیا۔ ہاں اور کیا! بھلا پڑوسن سے کیا سلائی ہوتی یا چکی پیستی۔ سو جھمیلے ہیں دنیا کے اور پیشوں میں ـــ میاں بیوی بچے ساس نند کی تو تو میں میں بھلا کون بھگتے ـــ بھلا یہ جوبن قائم رہتا جو پڑوسن کے بھی دو چار ساس نندیں ہوئیں ـــ توبہ کیجئے!

ایک دن جیسے ہی فلیٹ پر پہنچی۔ پڑوسن کے یہاں کسی کے چیخنے چلانے کی آواز آئی۔ سارے دن کی تھکن اس پر گھڑی بھر کو چین نہیں! اسکول سے آ کر جب تک کئی گھنٹے مردے کی طرح نہ پڑے رہو۔ تھکن نہیں اترتی۔ معلوم ہوتا ہے۔ کلاس میں لڑکیوں نے بھیجے کو گنے کی گنڈیری کی طرح مزے لے لے کر چبایا اور تھوک دیا۔ بڑی مشکلوں سے اس چوسی ہوئی گنڈیری کو تازہ کیجئے، صبح پھر وہ نکیلے دانتوں کے گھسے! سال میں ۲۶۰ دن یہی عمل جاری رکھے۔ اس کے بعد ـــ اس کے بعد پھر وہی چوسی ہوئی گنڈیری کا پھوگ۔

دروازہ کھلا اور وہ ایڑیاں مٹکاتی چلی آئیں۔ آتے ہی گرجیں۔

"میں تو عاجز آ گئی ہوں، نگار سے ـــ اللہ جانتا ہے، ایسی بھی کیا اسکول کی پڑھائی کہ ناس لگ گیا نہ"

اہو! تو گویا رنڈیوں کی لڑکیوں کے بھی اس قدر روشن ہوتے ہیں کہ مر سکیں خوب تو آپ بھی چلیں اعتراض کرنے!

"کیوں بھیجتی ہیں اسکول — اٹھا لیجیے"

"اوئی اٹھا لوں! — لو اور سنو — اے بی آجکل بے پڑھی لکھی کو کون پوچھتا ہے — آج کل تو بس گٹ مٹ کرتی میم چاہیے"

یہ مجھے آج معلوم ہوا کہ اس پیشے میں بھی تعلیم یافتہ ہونے کی ضرورت ہے شیکسپیئر اور ورڈس ورتھ کے حوالوں کی بھی ضرورتیں آتی ہیں"

"بات کیا ہوئی"

"اے وہ میں نے کہا بیٹی نگار آج کھڑا پاجامہ پہن لو — کہ نہیں — جو بات ہے نہیں — بس وہ موئی فراکیں چڑھا لو — میں نے کہا تم سمجھاؤ تو شاید مان جائے بات یہ ہے کہ کچھ لوگ دلی سے آ رہے ہیں —"، انہوں نے رازدارانہ انداز میں کہا اور میرا جی چاہا ان کا چقندر جیسا منہ کھسوٹ لوں، جی! یعنی میں سمجھاؤں! خوب تو گویا مجھے بی۔ ٹی میں رنڈیوں کی لڑکیوں کو پیشہ کے ہتھکنڈے ہی سکھائے گئے تھے۔ اب بھلا بتائیے یہ کیسے سکھاؤں کہ بھئی دتی والوں کے لئے پاجامہ پہنو، کلکتہ والوں کے ساڑھی اور لاہور والے شلوار پسند کرتے ہیں خوب! اور دوسرے مجھے یہ نگار مانتی سرے سے بری لگتی تھی۔ یعنی یہ کیا۔ یہ ہندو مسلم اتحاد یا فساد کا نمونہ ہے یا کیا؟ بڑے بڑے لیڈر چت ہو گئے اور یہاں تک محترمہ کی جدت پسندی نے ہندو مسلم سب کو گڈمڈ کر کے رکھ دیا۔ مگر یہ میری عادت ہے کہ میں ہمیشہ ہر شخص کو مجبور سمجھ لیتی ہوں، شاید لال بالوں والی سیٹھانی بھی مجبور ہی ہو گئی ہوں، گڑبڑ میں یاد نہ رہا ہو اور بجائے کسی کی حق تلفی کرنے کے انہوں نے

دونوں ہی کا خیال رکھا۔ خیر!

"تم کبھی ہماری طرف نہیں آتیں "۔ انہوں نے ڈھٹائی سے کہا۔ قبل اس کے کہ میں روکھا جواب دوں بولیں "نگار نے نئے توڑے سیکھے ہیں"

"اگر مجھے کسی وقت رنڈی پر پیار آتا ہے۔ تو اس وقت جبکہ وہ ناچ رہی ہو اس وقت وہ مجھے عین مین اس محنتی مزدور کی طرح معلوم ہوتی ہے جو پیٹ کی خاطر سرمایہ داری کے کولھو میں بیل کی طرح جتا ہوا ہو یا جیسے دس سیر اناج پیس لیا ہو۔ مگر مجھے طوائف کی زندگی کے دوسرے رخ سے گھن اس لئے نہیں کہ وہ کچھ مختلف ہے۔ بالکل نہیں ___ بلکہ ___ یا کچھ ضرورت سے زیادہ مشکل ہے ___ یہ بات نہیں ___ بلکہ یونہی۔

دوسرے دن ہمت کر کے میں سیٹھانی کے فلیٹ میں چلی ہی گئی کہ دیکھوں اندر سے ان لوگوں کے گھر کیسے ہوتے ہیں، اُفوہ بس یہ سمجھ لیجیے۔ کسی چھوٹے موٹے راجہ یا وزیر کا گھر ___ قد آدم تصویریں ___ برہنہ عورتوں کے مجسمے۔ یہ طوائفیں ننگی عورتوں کی تصویریں بھلا کیوں اپنے گھر میں رکھتی ہیں ___ بھلا اس سے کیا فائدہ سیٹھانی تو شاید اپنے جسم کی بھیانک سلوٹوں کو ان سڈول مجسموں کی آڑ میں دکھانا چاہتی ہے۔ ہوگا کوئی گران لوگوں کا!

نگار مجھے دیکھ کر ایسے شرمائی۔ گویا انڈا کھٹک کر باہر نکلی ہے اور بڑی دیر تک نخرے کرنے کے بعد آئی۔ سیٹھانی نے ڈانٹا تو خیر ریکارڈ لگا کر ناچنے لگی۔

یہ رنڈیاں! اف میں نے تو سنا تھا کہ ان کے جسموں کو گھن لگ جاتا ہے، مگر سیٹھانی تو لوہے کی لاٹھ رکھی تھیں اور اولاد تو خدا کی پناہ ___ کیا پھرتیلا لوچیلا جسم، جیسے ناگن انگڑائیاں لے رہی ہے۔ جب کلائی پر کلائی کی گرہ باندھ کر دہ

پنجوں سے توڑے لیتی تو اس کی ننھی ننھی ٹھوکروں سے ساری دنیا ہلکورے لینے لگتی میرا دل لرز اٹھا۔ اف یہ ناگن نہ جانے کتنوں کو ڈسے گی۔ نہ جانے کتنے شکار پھندے میں ٹھونسے گی، ویسے تو عورت دوسری عورت سے وقت بے وقت جل ہی جاتی ہے۔ مگر طوائف سے تو خدا کی پناہ —— ! عورت تو اپنا حصّہ یعنی ایک مرد لے کر بازار سے ہٹ جاتی ہے۔ مگر طوائف سے تو چھٹکارا نہیں جیسے دکان سے اناج لیتے وقت عوام تو حسب ضرورت لے کر ہٹ جاتے ہیں مگر خاص لوگ بھر بھر بورے تہ خانوں کے کلیجے میں اتار دیتے ہیں نتیجہ ! —— اگر اکنومکس پڑھی ہے تو بس سمجھ لیجئے اناج کی کمی ! تو یہ ہماری جنگ جو طوائفوں سے چلی آ رہی ہے۔ یہ بھی مزدور اور سرمایہ دار کی جنگ ہے۔ دکھ جھیلیں بی فاختہ اور کوے میوہ کھائیں کہتے ہیں۔ ایک دن ایسا دہکتا ہوا آئے گا کہ سارے مزدور سرمایہ داروں کو پیس کر پھینک دیں گے اور ان کا سارا سرمایہ چھین لیں گے۔ شاید عورتیں بھی اس طرح حملہ کر کے ایک دن طوائفوں کا "سرمایہ" چھین لیں ! شاید !

شام ہوئی تو گاہک آنے لگے —— مارے شرم کے میں سکڑی ایک طرف کو بیٹھی رہی کہ موقع ملے تو اڑوں کہیں یہ مجھے بھی ان میں سے ایک نہ سمجھ لیں۔ اور یہی ہوا کہ ایک بجھے ہوئے سے ایڈیٹر صاحب انہوں نے میرے سر چپکا دئے کمبخت میں کچھ بول بھی نہ سکی اور اس نے میرا سودا بھی کر دیا۔

تھوڑی سی دیر میں پورا ہال بھر گیا —— رنگین عورتیں اور عیاش مرد زور زور کے قہقہے چلنے لگے۔ ایک کونے میں چار چھ نے بیٹھ کر پینا اور جوا شروع کر دیا۔ دوسری طرف نگار گھیرے میں ادھر سے ادھر چہک رہی تھی۔ اس پر لوگوں کی خاص توجہ تھی ایک ادھیڑ سا مرد تو اسے گود میں گھسیٹ لیتا تھا اور وہ ہنس ہنس کر انہیں مار رہی تھی

مگر سماں تو سیٹھانی نے باندھ رکھا تھا۔ گہرے رنگ کے بھڑکدار کپڑے جو دن کو بے تکے لگ رہے تھے۔ اس وقت بہار دے رہے تھے۔ پاوڈر سرخی سے کیس جیسی پوتھی کہ دلہن دو چار کمسن لڑکوں میں گھری ہوئی نازک نازک چہلیں کر رہی تھیں۔ اس وقت بلا کی کم سن اور حسین معلوم ہو رہی تھیں۔ میں متحیر بیٹھی تھی کہ جوانی عمر سے ہوتی ہے۔ یا اداؤں سے۔ اور ادھر وہ ایڈیٹر صاحب بیٹھے مجھے چبا رہے تھے۔ انتہائی ترقی پسندانہ باتیں اور اس خوبصورتی سے کر میں ہکلا ہکلا کے رہ جاؤں، ان کی پوری توجہ ان برہنہ تصویروں کی طرف تھی جو میرے بہت ہی قریب ٹنگی تھیں بلکہ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے ہی جسم پر چپکی ہوئی ہیں، بار بار وہ انگلیوں سے ایسی تصویروں کے خطوط چھو کر ان کے حسن و قبح پر بحث کر رہے تھے۔ جس کے جواب میں گھبرا کر مجھے اپنے بٹوے میں کوئی نہایت ہی ضروری چیز ڈھونڈنا پڑتی تھی۔ گھما پھرا کر وہ عورتوں کے سینوں کے ادق مسئلہ پر آتے تھے اور آنکھوں میں میٹھی میٹھی نمی پیدا کر کے اپنے سوکھے ہاتھوں سے سانچے ڈھال ڈھال کر تشریح کر رہے تھے۔ باوجود اس قدر ڈھیٹ ہونے کے کئی دفعہ مجھے قالین کے نقش و نگار گھورنے پڑے، ہر جنبش پر یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ میرے جسم کو آٹے کی طرح خوب پیروں سے گھوند کر بھیانک سا پتلا بناتے ہیں پھر بگاڑ دیتے ہیں، انہیں مجھے اس طرح نچوڑنے میں کچھ مزا آ رہا تھا کیونکہ وہ برابر مسکرا رہے تھے۔ جل کر کئی دفعہ جی میں آیا کہ ان کے بھی کسی حصہ جسم کا ایسا مذاق بناؤں کہ ایک دفعہ تو غلیظ مسکراہٹ سے بھری آنکھ بھی جھینپ جائے مگر تہذیب نے زبان پکڑ لی موقع پا کر میں لپکی اپنے کمرے کی طرف۔ گیلری میں ایک فوجی نوجوان انگار کو بری طرح بھنبوڑ رہا تھا اور وہ اوں اوں کر کے اسے کھسوٹ رہی تھی۔

پلنگ پر لیٹ کر نہ تو نیند ہی آئی اور نہ ہی کچھ کام ہو سکا۔ دوسرے دن انسپکٹرس آنے والی تھی۔ مجھے اس کو رجھانے کے لئے سو سو بناؤ کرنا تھے۔ سبق موثر ہو۔ انداز گفتگو مرعوب کن، لباس مدبرانہ اور چال ڈھال میں نرمی آمیز دبدبہ — جماعت کی توجہ بورڈ کا استعمال۔ سوال و جواب کی اہمیت۔ میرے معزز پیشے کے شریفانہ گر! لیٹے لیٹے میں یونہی ورزش کرنے لگی۔ پھر ایک دم مجھے خیال آیا جو کوئی مجھے اس طرح دیکھ لے تو۔ کسی کی موجودگی کے خیال سے مجھے ایک دم تنہائی کا شدید احساس ہونے لگا۔ میں کتنی اکیلی ہوں سوائے ان قہقہوں کے جو مہیب چٹانوں کی طرح سیٹھانی کے فلیٹ سے لڑھک لڑھک کر میرے دماغ سے ٹکرا رہے تھے۔ گھنگھروؤں کی جھنکار اور تالیوں کی آوازیں ایک بارگی میرے جسم میں رینگ کر ہزاروں مفقود کی طرح پھڑ پھڑانے لگیں اور پھر بدی نے دماغ میں کروٹیں لینا شروع کیں ۔۔۔

اگر ان کروٹوں کا ایک رخ بھی کسی کو دکھائی دے جائے تو — تو نہ جانے کیا ہو۔ میں اسی خوف سے لرزا کرتی ہوں۔ مثلاً یہی کہ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے سیٹھانی بن سنور کر اپنے گاہکوں کو پیٹ کی خاطر لبھاتی ہیں۔ میں بھی کیل کانٹے سے درست ہو کر اپنے گاہکوں کے دربار میں جاتی ہوں۔ فرق اتنا ہے کہ میری عقل — وہی چوسی ہوئی گنڈیری — اور سیٹھانی — یعنی مکمل رس کا گھڑا میں دماغ بیچتی ہوں اور سیٹھانی جسم! اور میں دماغ کا مول سیکنڈ ہینڈ ٹائر کے برابر لیتی ستر روپیہ اور سیٹھانی اپنی ایک انگڑائی میں اتنا کما لیتی ہیں کہ میرے ابا حکومت برطانیہ کے اعلٰے افسر ہونے کے باوجود ساری عمر میں نہ کما سکے۔ ہم دونوں ہی بازار میں اپنے اپنے خوانچے لگائے بیٹھی ہیں۔ مال مختلف

مگر مقصد وہی میرے مرجھائے ہوئے دماغ کی حیثیت ان کے وسیع جسم کے آگے ایسی ہی ہے۔ جیسے پان بیڑی کی دکان کے آگے کرکٹ کلب، یقیناً میرا سوڈ برار ہا اور میں جلنے لگی اپنے تخیل سے بھڑکائی ہوئی آگ میں، لوگوں کو طوائفوں پر رحم آتا ہے۔ ان کے سدھار کی فکر میں ہیں۔ یہ نہیں کہ وہ تائب ہو جائیں۔ نہیں بلکہ جو بری گت سے ہیں ان کے دن پھر جائیں۔ ان کے میلے کپڑے زرق برق ہو جائیں سڑے بسے گندی نالیوں کے پاس جو مکان ہیں وہ ''میرین ڈرائیو'' پر پہنچ جائیں، گاہک آئیں مگر نہ اتنے کہ ان کا جی میلا ہو جائے اور یہاں تنخواہ کا گریڈ ہر سال گر جائے۔ کچھ پرواہ نہیں۔ طالب علموں یا دوسرے لفظوں میں دوزخ کے دروغاؤں کی تعداد دگنی ہو جائے۔ ہیڈ معلمہ جوس ڈالے۔ دفتر کے کلرک بھنبوڑ ڈالیں۔ کیٹی کے ممبر ڈکار جائیں —— کچھ پرواہ نہیں۔ استانیاں بچوں کے دماغ بنا رہی ہیں اور طوائفیں لاوارثوں کے دل کی ٹھنڈک —— دونوں ہی اپنا اپنا کام کر رہی ہیں۔ —— پھر یہ کیوں؟

جب رات اتنی دماغی کشتی لڑی ہو تو انسپکٹرس کے سامنے کیا ناز و ادا چلیں نتیجہ یہ کہ اس سال جو مستقل ہونے کی امید میں تھیں رخصت! جو مسلسل روح فرسائی کا ارمان تھا ختم! اف جس نے اپنی زندگی ہی قوم پر قربان ہونے کے لئے وقف کردی ہو...... وہ.... مگر قوم ان ادھ مری گایوں سے گھن کھا چکی ہے۔ یہ بیمار بکریاں —— ان سے قوم کو قے آتی ہے!

دوسرے دن سیٹھانی پھر آن پہنچیں —— اور مجھے ایسے نصیحت کرنے لگیں کہ کوئی میں بھی ان کے پڑوس کی ہوں اور اندھا دھند زندگی گذار رہی ہوں دراصل ہے بس ہر وقت پڑھنا —— اللہ مارا دماغ بھی ہل جاتا ہوگا!

میں منمنا کر چپ ہو رہی۔

"دیکھو تو کیا شکل نکل آئی ہے۔" ـــ انہوں نے رحم کھانا شروع کیا اور میرے دل میں بغاوت کا بھوت ناچا یہ مجھے کیوں چھیڑتی ہے خواہ مخواہ۔ یا اللہ یہ میں کہاں آ گئی! اوپر سے تو یہ عمارت بالکل شریفوں کے رہنے کی معلوم ہوتی ہے بورڈ پر نام بھی شریفوں جیسے ہیں! مس کوٹینو... مس ڈاکر... مسز عبداللہ مس رشید... مسز...

"حمید صاحب تم سے پھر ملنے کو کہتے تھے" ـــ یہ وہی ایڈیٹر صاحب تھے! ارے تو کیا اس نے واقعی مجھ سے پیشہ کرانے کا پکا فیصلہ کر لیا! یعنی اپنے گاہکوں میں سے مریل مریل چھانٹ کر مجھے دیتی جائے گی۔

"بھئی آج تمہیں ضرور سینما لے کر جاؤں گی" ـــ وہ اٹھلائیں

"مگر مجھے تو ـــ" واضح رہے کہ میرا پیشہ باعزت ہونے کے علاوہ کافی محنت طلب ہے۔

"ارے ہٹاؤ بھی تمہیں تو ہر وقت کام ہی رہتا ہے۔ حمید صاحب تمہارے لئے خاص طور پر پاس لائے ہیں اور تم ہو کہ ٹال رہی ہو ـــ ارے یہی تو ہنسنے بولنے کی عمر ہے۔"

یا مولا ـــ تو اب میرا مہذب پیشہ ختم اور یہ ہنستے بولنے کا پیشہ شروع ـــ توبہ اگر میری اماں بیچاری کو معلوم ہو تو کیا حال ہو ان کا ـــ کہ ان کی نیک بیٹی کو بہکایا جا رہا ہے۔ اور یہاں تو سودے بھی ہو گئے۔ آج پاس آ گئے۔ کل بنارسی ساڑھی، پرسوں ہیرے کے بندے اور اترسوں وہ خود معہ اپنے مصورانہ خیالات کے۔ اور وہ پھر ان کے وہ کھردرے سوکھے ہاتھوں سے سلیقے بنا بنا

کر۔۔۔۔ اللہ!

میں نے رکھائی سے انکار کر دیا اور وہ مضمحل سی بڑبڑاتی چلی گئیں۔

ورنہ توبہ ایسا بھی کیا ۔۔۔ جبھی تو کہتے ہیں اتنا پڑھانا لکھانا بھی اچھا نہیں

لڑکیوں کا ۔۔۔"

جی ہاں! کیوں نہیں ۔۔۔ پڑھ لکھ کر کریں گی ہی کیا ۔۔۔ آپ کا لطیف پیشہ سلامت رہے۔ کیا ضرورت ہے کہ دماغ پچی کرے کوئی! میری سمجھ میں نہ آیا کہ باوجود اتنی بدمزاجی کے مجھ میں کیا دلچسپی تھی جو بار بار پڑوسن آتی تھیں۔

میں کاپیاں درست کرنے لگی۔ یا خدا یہ فیل ہونے والے بھی جان جان کر جلاتے ہیں، جی چاہتا ہے۔ صفر سے بھی کوئی ذلیل تعداد ہو تو وہ نکال کر دوں انہیں مریں کمبخت جی چاہا جو فیل نہیں ہوئیں۔ ان کو بھی فیل کر دوں ۔۔۔ تاکہ سب کی سب سیٹھانی کی طرح تباہی کے غار میں گر پڑیں۔ پھر ایک دم سے میں نے سوچا نہیں ۔۔۔ یہ تو نہایت عجیب سزا ہوگی ۔۔۔ بہتر یہی ہے کہ میں انہیں اپنی طرح قوم کی خدمت کے لئے باہمت اور محنتی استانیاں بنا دوں ۔۔۔ تاکہ ۔۔۔ تاکہ ۔۔۔ وہ بھی۔۔۔۔ آگے سوچنے کی طاقت ٹھٹھیا کر رہ گئی۔

سیٹھانی اور نگار ہنستی کھلکھلاتی حمید صاحب اور دو چار اور بھٹکتے ہوئے عاشقوں کے ساتھ سینما گئیں۔ جب وہ آئیں تب بھی میں جاگ رہی تھی۔ جہاں غنودگی آئی اور عفریتوں نے دانت نکال کر حملہ کیا۔ بھلا اس طرح کون کام کر سکتا ہے۔ دو چار دن اور رہی رنڈی کے پڑوس میں تو نہ جانے کیا ہو۔ میرے خیالات دن بدن الجھتے جا رہے تھے۔ خود اپنے ضمیر سے بات کرتے ڈر لگتا

تھا۔ کہ نہ جانے کمبخت کیا بول اٹھے۔

میں سر پکڑے پلنگ پر بیٹھی رہی — تھکی ہاری سیٹھانی سو گئی تھی — فلیٹ پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ چند واہیات خیالات دل میں جھانکے۔

ذرا ڈھیل ڈی تو ریلا کا ریلا ٹوٹ پڑا — قہقہہ پر قہقہہ میرے دماغ میں سے ابلنے لگا مگر میرا چہرہ نہ ہنسا۔۔۔ عزت پاک بازی۔۔۔۔ گندے انڈے کی طرح پوٹے کے نیچے دبائے بیٹھے رہو۔۔۔ تو کیا اس میں سے سرخاب نکلے گا؟ اور پھر تماشہ یہ کہ کوئی بھی اس گندے انڈے کی سیوا کا پھل نہیں دیتا۔ قوم کو ذرا بھی احساس نہیں — کہ ایک دیوی یوں پارسائی کا پٹارہ اٹھائے جی چاہا اٹھا کر بیچ سڑک پر ایسی جگہ چھوڑ دوں کہ ہر آنے جانے والا غلاظت سے لتھڑ جائے۔ یہ مجھے کیا ہو رہا تھا — یہ سب اس رنڈی کے پڑوس میں رہنے سے ہوا! مجھے فوراً اپنی سہیلی بینا یاد آ گئی! اف. بینا کتنی حسین اور چلبلی تھی اور وہ پھر مسلسل نو سال پڑھاتی رہی۔۔۔۔ اور پھر ایک دن بوکھلا کر اس نے ایک غلیظ بڈھے سے شادی کر لی۔۔۔ وہ تو کہتی تھی کہ وہ اس کی قومی خدمات کو دیکھ کر اس پر عاشق ہو گئی تھی۔ وہ سولہ برس جیل کاٹ کر آیا تھا اور کسی زمانہ میں حسین بھی تھا۔ مگر مجھے معلوم تھا کہ بینا قوم کی خدمت کی آڑ لے رہی ہے۔ جیسے سیٹھانی برہنہ تصویروں کی آڑ لیتی ہے۔ دراصل بھوک میں کوارٹر یا پرٹر ہو جاتے ہیں۔

میں نے پکا ارادہ کر لیا کہ فلیٹ بدل دوں گی۔ ورنہ جو ہر بے بہا کیچڑ میں جا پڑے گا اور وہ دولت جس کے پیچھے مشرقی عورت جان دے دیتی ہے مٹی

میں مل جائے گی۔ دنیا میں عورت کے پاس یہ عصمت ہی تو ایک شے ہے جسے کوئی پیٹ کی خاطر لٹاتی ہے۔ تو کوئی اس کی خاطر جان لٹا دیتی ہے۔ لے دے کر یہی ایک ترپ کا اکہ ہے جو ہر داؤں پر مار سکتی ہے۔

تھک ہار کر خیالات میں الجھی سونے کی کوشش کرنے لگی۔

صبح اٹھ کر میں جب نیچے جانے لگی تو سیٹھانی پھل والے سے کھڑی الجھ رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر غیروں کی طرح منہ پھیر لیا۔ فخر سے میرا سر اونچا ہو گیا۔ آخر کو اسے معلوم ہو ہی گیا کہ میں شریف ہوں ــــ اور وہ بازار کی جنس!

اس کے دو چار دن کے بعد کا ذکر ہے کہ میرے ماموں زاد بھائی اور ان کی بیوی آئے ــــ جب سے میں نے یہ فلیٹ لیا تھا میں ڈر رہی تھی کہ وہ شاید یہ سن کر چراغ پا ہوں کہ میں ایسے پڑوس میں رہتی ہوں جیسے ہی وہ آئے سیٹھانی کے فلیٹ سے قہقہے بڑی بڑی چٹانوں کی طرح لڑھک لڑھک کر گرنے لگے ــــ میں نے اٹھ کر نفرت سے دروازہ بھیڑ دیا۔

"کمبخت ہر وقت بدتمیزیاں ہوتی رہتی ہیں۔"

"کہاں"

"یہاں ــــ کمبخت ایک طوائف رہتی ہے ــــ ہر وقت ٹھٹ لگے رہتے ہیں۔"

"طوائف! ــــ یہاں! ــــ مگر یہ تو نگار کی آواز تھی" وہ چونکے

"ہاں ــــ آپ جانتے ہیں انہیں ــــ!" میں نے معنی خیز نظروں سے ان کی بیوی کو دیکھا۔

"ہاں ہاں بھئی — ارے تم نہیں ملیں ان سے — میں نے تو نگار کے ٹانسلز کا آپریشن کیا تھا — ارے یہ تو بڑے خاندانی لوگ ہیں"۔

"یہ — یہ — سیٹھانی —"

"ہاں بھئی — سیٹھ عبداللہ کی بیوی — سر عبدالکریم کے خاندان میں سے ہیں — اور دلی کی ہیں ان کی بیوی — چشتیوں کے خاندان کی ہیں۔ اور رضیہ کی خالہ لگتی ہیں۔"

"ممانی" رضیہ بولیں۔

اور میں حیرت زدہ ان عبرتناک زلزلوں کو چھپانے کی کوشش کرنے لگی، سن رہ گئی۔ جیسے میں نے کسی مقدس کتاب کو ٹھوکر مار دی ہو — اور کفارہ — کفارہ میرے امکان سے باہر ہو گیا۔

"تو — تو وہ کوئی دوسرا فلیٹ ہو گا" میں نے ہکلا کر کہا۔

باورچی

میرا باورچی ـــ کاش ان غرور میں ڈوبے ہوئے الفاظ کو منہ سے نکالنے سے پہلے انسان اتنا سوچ لے کہ یہ دنیا فانی ہے! مورکھ! یہاں کوئی کسی کا نہیں، دو دن کی چاندنی اور پھر گھور اندھیرا ہے۔ میرا تیرا کچھ نہیں تو پھر باورچی جیسی ناپائدار ہستی جو چلتی پھرتی چھایا ہے۔ آج یہاں کل وہاں.... کسی کی کیسے ہوسکتی ہے۔ بیٹے! آج مزے سے قورمہ متنجن اڑا رہے ہیں تو کل ایک ایک ٹکڑے کو محتاج، ہوٹلوں کی در بدر خاک چھان رہے ہیں۔ ابھی ابھی یہ سوچ رہے ہیں، کہ اتوار کو جو دوستوں کی دعوت کی ہے۔ اس میں شاہی ٹکڑے اور فرنی کافی ہوگی یا دو چار انگریزی مٹھائیاں بھی بنوالی جائیں، باورچی تو ہے ہی،، کیوں نہ لوگوں پر رعب ڈال دیا جائے۔ لیکن اچانک اطلاع ملتی ہے کہ باورچی کو شریف، بامروت اور پیارے ہمسائے نے پانچ روپیہ زیادہ دے کر ہضم بھی کرلیا جیسے چیل جھپٹا مار کر بچہ پنجوں میں دبوچ لے جاتی ہے اور غریب مرغی آہ وزاری کرتی رہ جاتی ہے بالکل اسی طرح بیکس ولاچار بدمذاق ہوٹلوں کے رحم وکرم پر زندگی کے دن گذارنے لگتے ہیں۔

میرا باورچی...... جی میں نے غلطی کی... کاش میرا... بھی کوئی باورچی ہوتا یہاں اس گھر میں جس کا کرایہ میں ادا کرتی ہوں۔ بیشک ایک جناتی قسم کا باورچی تھا

ہے۔ جس کی ملکیت توا، چولھا وغیرہ ہے۔ اور اس کے علاقہ میں چمٹا، پھکنی اور جھینگروں، چوہوں وغیرہ کے علاوہ دو نہایت غیر اطمینان بخش قسم کے انسان بھی رہتے ہیں اور اپنی خودداری کو شدید ٹھیس لگاتے ہوئے اقبال ہوں کہ ان دو ہستیوں میں سے ایک تو خود میری گناہگار شخصیت ہے۔ اور دوسری میرے خدائے مجازی کی۔ شاید پڑھنے والوں کو شبہ ہو رہا ہے۔ کہ باورچی انتہا درجہ کا گستاخ، غیر مہذب اور مرکھنا ہوگا۔ جی نہیں۔ ساری مصیبت تو یہی ہے کہ وہ خطرناک حد تک مہذب، فرمانبردار اور کم سخن ہے۔ لوگ کہیں گے تو پھر یقیناً میرا دماغ کچھ خراب ہے۔ جی نہیں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے نہ تو دماغ خراب ہی ہے اور نہ ضرورت سے زیادہ چھوٹا، گو اگر آپ میرے باورچی کی رائے لیں تو وہ یقیناً رفاہِ عام کی غرض سے مجھے فنا کر دینے یا کسی دماغی ہسپتال میں داخل کرنے کا مشورہ دے گا۔

ہاں تو کاش یہ باورچی اور دوسرے باورچیوں کی طرح ذرا بدتمیز، تھوڑا سا گستاخ اور ضدی ہوتا تو زندگی کتنی دلچسپ اور بے تکلف گذرتی۔ اگر وہ تھوڑا سا غیر مہذب ہوتا تو میں کتنی آسانی سے کرسی پر اکڑوں بیٹھ کر کھانا کھا سکتی، کیونکہ مجھے اس طرح کھانے میں لطف آتا ہے۔ مگر کیا ہوتا ہے۔ جونہی میں کرسی پر آلتی پالتی مارتی ہوں، اسے یا تو جادو کے زور سے پتہ چل جاتا ہے۔ یا اس نے میرے کو رشوت دے کر جاسوسی پر مقرر کر رکھا ہے۔ کہ وہ میری جا کر شکایت کر دیتا ہے۔ اور کسی نہ کسی بہانے سر جھکائے آنکھیں نیچی کئے پشت پر ہاتھ باندھے نازل ہو جاتا ہے۔ گویا اگر اس کی شرارت بیچ میں حائل نہ ہوتی تو اس کے پکائے ہوئے کھانے کی توہین کی پاداش میں وہ مجھے کرسی پر سے دھکا دے کر گرا دیتا۔ اب میں لاکھ چاہتی

ہوں، کہ ڈھٹائی لاوے ویسے ہی بیٹھی رہوں۔ مگر نہ جانے کون سی مقناطیسی طاقت سے بے جان ہو کر میرے پیر خود بخود کرسی سے پھسل کر سرنگوں ہو جاتے ہیں، اس وقت میری اتنی سبکی ہوتی ہے کہ کچھ میں ہی جانتی ہوں احساس کمتری ایک دم ناقابل برداشت طور پر بڑھ جاتا ہے۔ اور اپنی ہستی نہایت ناکارہ، چھوٹی اور فضول سی معلوم ہونے لگتی ہے۔ ساتھ ساتھ مجرم کی طرح میں دیکھتی ہوں کہ میں اس چھری سے جو در حرف ما، مچھلی کھانے کے لئے لگائی گئی تھی۔ آلو کے کباب کھا رہی ہوں۔ میری طبعی بزدلی کہتی ہے کہ ظالم کی نظر بچا کر چھری بدل لوں۔ بغاوت کہتی ہے نہیں ان پابندیوں کو توڑ کر آزاد ہو جاؤں چنانچہ غلط چھری سے غلط کھانا کھانے پر نہایت استقلال سے مصر رہتی ہوں، میں ترقی پسند ہوں، کسی کی حکومت سہنا کسر شان سمجھتی ہوں۔ باورچی کچھ نہیں بولتا۔ لیکن اس کے یہ تو معنی نہیں کہ خاموش رہتا ہے۔ قدرت کے بنائے ہوئے فرسودہ اصول پر عمل کر کے وہ زبان سے بولنا اپنی ہتک سمجھتا ہے مگر اسکا

جھکا ہوا سر تاسف سے ہلتا ہے، نیچی آنکھیں اس شرمناک نظارے کی تاب نہ لاکر اور جھک جاتی ہیں۔ کندھے نفرت اور حقارت سے متاثر ہو کر پر معنی جھٹکے دیتے ہیں، اور جس طرح بلی کو دیکھ کر چوہا بست ہو جاتا ہے۔ میری بھی تمام قوتیں شل پڑ جاتی ہیں۔ چھری کانٹے، رسیاں تڑا کر ہاتھوں میں سے بھاگنی شروع کر دیتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے۔ آلو کے کباب نہیں کھا رہی ہوں بلکہ جھک مار رہی ہوں تھک کر چھری کانٹے کو سیدھا سیدھا پلیٹ میں لٹا دیتی ہوں، خدائے باورچی خانہ کے اشارے سے بیرا ملک الموت کی طرح پلیٹ

میرے سامنے سے جھپٹ لے جاتا ہے۔ اور نیم خوردہ کباب کے تصور کو خون کے گھونٹ کی طرح پی کر رہ جاتی ہوں پلیٹوں کی اس آواگون کی وجہ سے دماغ کا توازن کچھ ایسا بگڑ جاتا ہے۔ کہ بدہضمی کی نوبت پہنچ جائے پھر بھی ایک غیر فانی بھوک طبیعت پر چھائی رہتی ہے۔ جب سے یہ باورچی آیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ میں خود اپنے گھر مہمان آئی ہوں۔

خیر اگر اتنی ہی بات ہوتی تو صبر آجاتا۔ دل کو سمجھاتی کہ دنیا بھی تو ایک سرائے ہے۔ ہم سب مہمان ہی تو ہیں۔ نہ جانے کب سفر کی تیاری شروع ہو جائے۔ مجھے اس سفر سے قطعی انکار نہیں۔ لیکن یہ بھی نہیں چاہتی کہ قبل از وقت لشتم پشتم بھاگ نکلوں۔ خودکشی گناہ ہے۔ مگر میں سچ عرض کرتی ہوں کہ اگر میں اس فعل مکروہ کی کبھی مرتکب ہو جاؤں تو قانوناً پھانسی اس بے رحم باورچی کو ملنی چاہیے میں سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں مگر یہ جو آئے دن نئے کھانوں کے تجربے کیا کرتا ہے۔ انہیں سہنا میرے بس کا روگ نہیں، دنیا جانتی ہے کہ کھانا انسان کی دلچسپی کے لئے پکتا ہے۔ نہ کہ انسان کھانے کی ناز برداریوں کے لئے، زبان کھانے کو چکھتی ہے۔ نہ کہ کھانا زبان کو۔۔۔ پھر کیا وجہ کہ یہ ظالم ایسے کھانے ایجاد کرتا ہے۔ جو اگر بطور آتشبازی استعمال کیے جائیں تو قانون کی زد میں آجانے کا ڈر ہو۔ اول تو ان کھانوں کو شناخت کرنا ہی دشوار ہے۔ معلوم ہوگا، چمٹے پھکنیاں اور بیلن وغیرہ غلطی سے پک گئے ہیں۔ خیر جب یہ غلط فہمی دور ہو گی تو پوچھئے کہ یہ ہے کیا جس پر خوراک انسانی ہونے کا الزام تھوپا گیا ہے۔ کبھی معلوم ہوگا روئی کی ٹھوس گولیوں کو گھی مسالے میں لیتھڑ دیا گیا ہے۔ کبھی شبہ ہوگا، بچوں کے

کھلونے اور سنگھار کی چیزوں کو اس طرح کارآمد بنانے کی سعی فرمائی گئی ہے۔ گرانی کا زمانہ ہے نا جو کچھ بھی کفایت کی آڑ لے کر نہ کر ڈالا ہو کم ہے۔ اب اس عرصہ میں قوت فیصلہ بالکل مفلوج ہو چکے گی۔ کبھی تو اصلی پھلوں کو نکھٹو کی دستکاری سمجھ کر حماقت کا ثبوت دینا پڑے گا اور کبھی مصنوعی کاغذ کے پھولوں کو اصلی سمجھ کر انتہائی طفلانہ حرکت سرزد ہو جائے گی۔

لوگ کہیں گے بھئی کیا باورچی ہے۔ کیا میز سجاتا ہے۔ مگر میں خوب جانتی ہوں۔ وہ یہ سب کچھ کیوں کرتا ہے۔ بیوقوف بنانے کے لئے وہ بڑے سوچ بچار کے بعد یہ جال بچھاتا ہے اور جب ہم اس میں الجھ کر قلابازیاں کھانے لگتے ہیں تو نہایت داد طلب نگاہوں سے ہماری جملہ بدحواسیوں کو بغور نوٹ کرتا جاتا ہے۔ تاکہ پڑوس کے تمام باورچیوں کے سامنے ان کا مذاق اڑا کر لطف اٹھائے یہ سب وہ صرف اُلّو بنانے کے لئے کرتا ہے۔ ورنہ خود ہی سوچیے آقا اور خادم کے درمیان یہ سالی بہنوئی جیسا رومنٹک مذاق کیا معنی رکھتا ہے۔ ابھی پچھلے

دنوں کا ذکر ہے۔ کہ میز پر ایک عجیب و غریب ہیولا ایک بڑی سی قاب میں بڑے طمطراق سے جلوہ فروز نظر آیا، سب ایسے چونکتے ہو گئے جیسے غنیم کے پھینکے ہوئے بم کو دیکھ لیا ہو۔ نہایت ہوشیاری سے باورچی کی آنکھ بچا کر پہچاننے کی کوشش اتنی ہی بے سود اور دشوار ثابت ہوئی جیسے دریا میں کود پڑنے کے بعد خشک رہنا، مجبوراً اس کی پرمعنی مسکراہٹ سے دہشت زدہ ہو کر ایسی صورت بنالی جیسے پہچان گئے کہ کیا پکایا ہے۔ ہمارے پیارے باورچی نے اب نہایت مودب تکلف کے ساتھ قاب اٹھا کر ایک دوسرے کے سر منڈھنا

شروع کی۔

"اوہو.... شکریہ...... مگر میرا تو پرہیز ہے.... ذرا سا لے لوں گا ــــ پہلے آپ لیجئے"...... بدقسمتی سے ایک بن بلائے مہمان بھی آن پھنسے تھے۔ لہٰذا دھر لئے گئے بیچارے۔ اب لرزاں و ترساں چاروں طرف سے دیکھ رہے ہیں کہ کس رخ سے اور کس اوزار سے حملہ آور ہوں۔ گویا قلعہ فتح کرنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ نیز اس میں جو سبز اور سفید پھول رکھے ہیں۔ انہیں کھا ہی جائیں یا وہ صرف نمائش کی غرض سے رکھے گئے ہیں۔ یقین مانئے یہی صاحب ایک بار پورا کا پورا کاغذ جو سجاوٹ کی غرض سے لگایا گیا تھا نگل چکے تھے۔ لہٰذا قدرتاً محتاط تھے۔ اب یہ نہیں کہ کمبخت باورچی ہر نئی قاب کے ساتھ کم ازکم ایک پرچہ ترکیب استعمال تو دے دیا کرے۔ جی نہیں وہ نہایت مودب فاصلہ پر کھڑا لطف لے رہا ہے۔ جب میز پر رکھے ہوئے سب ہتھیار ناکارہ ثابت ہو کر پھاوڑوں، ہتھوڑوں اور درانتیوں کی ضرورت محسوس ہو گی تب وہ نہایت معصوم اور بھولی آواز میں بتائیگا کہ بجائے پاگلوں کی طرح کشتی لڑنے کے اگر اسی شئے کو سیدھے سادھے چمچہ سے نکالا جاتا تو کبھی اتنی بے لگام نہ ہو جاتی، یہی ہوا جب وہ غریب مہمان اچھی طرح جسمانی اور دماغی طور پر پست ہو چکے تو معلوم ہوا کہ جس چیز کو وہ اس قدر جوش و خروش سے ذبح کر رہے تھے۔ وہ صرف رکابی کا پیندا تھا آدمی وہمی ہیں، کھانے سے پہلے ساری خودداری کو بالائے طاق رکھ کر نہایت لجاجت سے پوچھا کہ یہ ہے کیا بلا؟ جواب ملتا ہے۔

"سرکار بھیوریاں!"

"ایں بھپوریاں ..... یعنی کیسی بھپوریاں ؟"

"ہوتی ہیں حضور" ۔

یہ لیجیے۔ کیا جواب دیا ہے۔ گویا کمبخت بھپوریاں بھی فلسفہ ہو گئیں جو ہم جیسے کوڑھ مغزوں کی سمجھ میں نہ آئیں گی اور صرف ان کا ہونا تو اس بات کی دلیل نہیں کہ انہیں کھانا بھی پڑے، یوں ہونے کو تو دنیا میں ہزاروں چیزیں ہوتی ہیں جواب ملتا ہے۔

"سرکار مونگ کی دال سے بنتی ہیں" ۔

اب بھلا مونگ کی دال جیسی شریف الطبع جنس پر کون شبہ کر سکتا ہے۔ اگر ناریل کے خول چھوارے کی گٹھلیوں وغیرہ سے یہ حرکت سرزد ہو جاتی تو قابل معافی تھی مگر یہ مونگ کی دال اور اس درجہ کم بخت !

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی واضح کر دیتا ہے کہ یہ بھپوریاں نسیم "اشوک کمار چندر موہن، دیوکارانی وغیرہ کا مرغوب ترین کھاجا ہیں۔ اب کس میں اتنی سکت رہ جاتی ہے کہ ان عظیم الشان بھپوریوں کو کھانے سے انکار کرے۔ جنہیں نسیم۔ کون نسیم ! وہی پکار کی ملکہ نور جہاں پسند کر چکی ہے۔ مگر میں خوب جانتی ہوں کہ جیسے ہم بچوں کو "بی شادی" اور ہوّے کے نام سے ڈراتے ہیں۔ اس طرح مجھے مرعوب کرنے کے لئے یہ باورچی معزز ہستیوں کے افسانے سناتا ہے۔ جن کے یہاں وہ نوکر رہ کر بھپوریاں کھلانے کے دعوے کرتا ہے۔ اور یہ بھی مجھے معلوم ہے کہ یہ ان بیچاروں کے سر مفت الزام تھوپ رہا ہے۔ اگر ہمارے سوا کسی خود دار اور ذی ہوش انسان کے سامنے یہ ان منحوس بھپوریوں کا نام بھی لے دیتا تو آج یوں ہنس ہنس کر ہمارے

سینے پر مونگ نہ دلتا ہوتا۔ بلکہ کبھی کا داعیٔ اجل کو لبیک کہہ چکا ہوتا اور آج میں بجائے اپنی کم مائگی پر ماتم کرنے کے اس کا مرثیہ لکھ کر شہرتِ دوام حاصل کر چکی ہوتی۔

مجھے یہ معلوم ہے کہ اس وقت تمام پڑھنے والے میرے وجود پر لعنت بھیج رہے ہوں گے۔ پھوہڑ ہوں، امور خانہ داری سے واقف نہیں ورنہ عورت ہو کر ایک ادنیٰ باورچی سے اس حد تک دبنا کیا معنی؟ تو عرض یہ ہے۔ کہ میرا باورچی وہ جنس نہیں جسے صنف نازک کی نزاکت یا صنف زبردست کی طاقت مرعوب کر سکے۔ وہ باورچی ہے۔

تلنا، پکانا، بھوننا، جھلسنا اور جلانا اس کا پیشہ، — کچلنا، پیسنا اور کاٹ چھیل کر نمک پاشی کرنا اس کا دلچسپ ترین مشغلہ، وہ جراح ہے، شاعر نہیں! اخلاقیات سے اسے کیا سروکار۔

مگر باوجود ان مظالم معشوقانہ کے اگر باورچی کو بخار آجائے۔ کسی شادی بیاہ میں چھٹی پر چلا جائے یا کوئی بے ایمان پڑوسی اسے ہڑپ کر جائے تو سارے گھر کا وہی حال زار ہوتا ہے جو شیر خوار بچے کی دودھ کی بوتل ٹوٹ جانے پر بات یہ ہے کہ وہ ہمارا آقا ہے۔ اور ہم اس کے .... معاف کیجئے گا۔ میں نے غلط کہا، میرا مطلب ہے.... وہ ہم اس اوہ .... خیر جانے دیجئے۔

ایک شوہر کی خاطر

اور یہ سب کچھ بس ذراسی بات پر ہوا۔ مصیبت آتی ہے تو کہہ کر نہیں آتی پتہ نہیں وہ کون سی گھڑی تھی کہ ریل میں قدم رکھا کہ اچھی بھلی زندگی مصیبت بن گئی۔ بات یہ ہوئی کہ اگلے نومبر میں جودھپور سے بمبئی آرہی تھی۔ سب نے کہا۔ دیکھو پچھتاؤگی۔ مت جاؤ۔ مگر جب چیونٹی کے پر نکلتے ہیں تو موت ہی آتی ہے۔

سفر لمبا اور ریل زیادہ ہلنے والی۔ منہ دور اور ریت کے چھپاکے، اوپر سے تنہائی۔ سارا کاسارا ڈبہ خالی پڑا تھا۔ جیسے قبرستان میں لمبی لمبی قبریں ہوں۔ دل گھبرانے لگا۔ اخبار پڑھتے پڑھتے تنگ آگئی۔ دوسرا لیا۔ اس میں بھی وہی خبریں! دل ٹوٹ گیا۔ کاش ہیں قبرستان میں ہی ہوتی، بلا سے مردے نکل پڑتے۔ بینچوں کو دیکھ دیکھ کر جی ہول رہا تھا "کاش کوئی آجائے ـــ کاش ـ کاش ـــ" میں نے دعا مانگنی شروع کی۔

ایک دم سے جو ریل رکی تو ایک دم سے جیسے ٹیڑیاں ٹوٹ پڑیں۔ انسان تو کم آئے بچے اور ٹپلیاں زیادہ۔ بچے ایسے جو قحط زدہ گاؤں سے آرہے تھے کہ اُتنے ہی خوراک پر بل پڑے۔ دودھ پینے والوں کو تو خیر تیار معاملہ مل گیا اور وہ جٹ

گئے۔ باقی کے تلملانے اور تڑپنے لگے۔ پتیلیاں اس قدر بے ہنگم اور فضول جگہ گھیرنے والی وضع سے بندھی تھیں کہ کسی کل بیٹھتی ہی نہ تھیں، ایک سنبھالی تو دوسری تیار۔ میں علیحدہ پڑی پر اس زاویہ سے بیٹھی تھی کہ گٹھڑی گرے تو میری ریڑھ کی ہڈی بچ جائے۔ مجھے اپنے جسم میں بس ریڑھ کی ہڈی سب سے زیادہ عزیز ہے۔ کہتے ہیں کہ ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ جائے تو آدمی لوتھڑا ہو جاتا ہے۔

"کہاں جا رہی ہو؟" بچاری ہم سفر نے گٹھڑیوں کی طرف سے غیر مطمئن ہوتے ہوئے بھی نہایت فکر مند ہو کر پوچھا۔

میں نے جلدی سے بتایا اور پھر ان کی توجہ اس بچی گٹھڑی کی طرف منعطف ہو گئی جو شاید برتنوں کی تھی۔ اور ذرا سی ٹھیس سے گرنے کو تیار۔ اگر اتفاقیہ ذرا سا ہاتھ لگ جاتا تو برتن اس تیزی سے آپس میں ٹکراتے کہ جی گھبرا اٹھتا۔

"کہاں سے آ رہی ہو——"

میں نے ذرا کم مستعدی سے بتایا۔

"میکے جا رہی ہو؟"

جب تک شادی نہ ہوئی ہو جب تک جگت میکہ ہی ہے اور کہیں بھی نہیں۔ یعنی میکے اور سسرال کا سوال ہی نہیں۔ لہٰذا میں ذرا چکرائی۔ سوچا اندازاً کس صوبہ میں شادی ہونے کا خطرہ ہے۔

"میاں کے پاس جا رہی ہو؟"

"نہیں!" میں نے چاہا موضوع بدل جاتا تو اچھا ہوتا۔ خواہ مخواہ کون ہمدردی وصول کرے۔

"تو پھر سسرال جا رہی ہو گی ۔۔۔ کیوں؟" ذرا ان سوالوں کے جواب بہت فلسفیانہ ہوتے ہیں۔

"نہیں ۔۔۔ تو ۔۔۔ میں بمبئی جا رہی ہوں ۔۔۔ شادی ۔۔۔ شادی تو نہیں ہوئی۔" میں نے ذرا دل میں کچھ حقیر ہو کر کہا۔ حالانکہ شادی کے خلاف کالج کے مباحثہ میں، مجھے اوّل انعام ملا تھا اور اب بھی ۔۔۔ خیر اب تو ۔۔۔ ہاں تو ۔۔۔ میں نے کہا۔

وہ متحیر ہو کر اتنی زور سے اچھلیں کہ بچے کے منہ سے دودھ چھوٹ گیا اور وہ مذبوحہ بکری کی طرح چیخا۔ میں دھیان ہٹانے کو ان کی توجہ بچے کی طرف کرنا چاہی، مگر وہ ٹٹول ٹٹول کر بچے کی ناک میں دودھ ٹھونسنے لگیں۔ اور میں یہاں کچھ لکھنا نہیں چاہتی کہ مجھے انہوں نے کس رحم اور مہربانی بھری آنکھوں سے دیکھا۔ انہیں مجھ پر محبت سی آنے لگی اور میں ڈری کہ وہ کہیں مجھے چمٹا کر رو نہ پڑیں۔ ان کا دل بہلانے کے لئے میں نے چنے والے کو بلایا۔ مگر وہ ویسی ہی اداس رہیں۔ انہوں نے مجھے دو ایک داؤں پیچ ایک اچھا سا شوہر پھانسنے کے بتائے جو بعد میں تجربہ سے قطعی بے کار ثابت ہوئے۔

میری دعا شاید ضرورت سے زیادہ قبول ہو گئی۔ یا شاید میری خدا کے حضور میں کاتبین کی غلطی سے دوبارہ عرضی پیش ہو گئی کہ ایک موج انسانوں کی پھر آئی۔ اس موج میں بڑے بڑے ریشمی برقعے اور چھتریاں زائد تعداد میں تھیں۔ ان کے ساتھ گنے بھی تھے۔ جن کے ٹکڑے ناپ ناپ کر اتنے بڑے کٹے گئے تھے کہ ریل کے

کسی کونے میں ٹھیک سے نہ رکھے جا سکیں۔ ان کے بستر اور صندوق کچھ ایسے تھے جو کسی پٹڑی کے اوپر یا نیچے کسی انداز سے بھی نہ رکھے جا سکتے تھے۔ ان بیویوں نے آتے ہی ریل میں ہلا چلی مچادی۔ صندوق اور پلندے گھسیٹ کر تباہ کر دیا پہلے والی مسافرہ کی ضدی پوٹلیاں جو شاید تاک میں تھیں کہ بچوں اور عورتوں پر گریں اور وہ ایک دوسرے پر گرے۔

'کہاں جا رہی ہو؟' یہ بھی کچھ پریشان تھیں۔

بتایا۔

'کہاں سے آ رہی ہو؟' بولیں۔ حالانکہ ابھی ٹھیک سے جمی بھی نہ تھیں۔ برقعہ پھانسی لگا رہا تھا ——— مگر بتایا۔

"میکے جا رہی ہو یا سسرال؟" کاش مجھے معلوم ہوتا۔ مگر چوں کہنے کا موقع نہ تھا۔ "سسرال" ایسے کہا وہ ہم سفر جو پہلے جرح کر چکی تھیں نہ سن پائیں۔

"کیا کرتے ہیں میاں؟"

اب میں نے سوچا کہ کچھ تو کرتے ہی ہوں گے۔ بے کار تو کاہے کو پھرتے ہوں گے۔ مگر کاش وہ مجھے بھی بتا دیتے تو اچھا ہی تھا بہر حال نکھٹو تو نہ ہوں گے پر۔

وہ خود ہی بولیں "ریلوے میں ہیں۔"

"ہاں ——— ہاں" میں نے پُر شوق لہجہ میں انہیں یقین دلایا۔ "یہ ٹھیک رہا۔" میں نے سوچا ریلوے کا آدمی خوب رہے گا۔ مزے سے مفت کے ٹکٹ تو

ملیں گے۔ ہندوستان بھر میں گھوم لو۔ اور مجھے وردی بھی ان کمبختوں کی کچھ پسند ہے۔ خصوصاً وہ بیلٹ اور ٹوپی —— لال ہری جھنڈی۔ اچھا ہی ہوا جو یہ بیچاری مل گیئں۔ ورنہ اپنے کو تو کبھی گارڈ بابو وغیرہ کا خیال بھی نہیں آیا۔ اسے ہاں سچ تو ہے۔

"کون کام پہ ہیں —— وہ ریل میں"

کسی ٹھیک ہی کام پر ہوں گے —— اور کیا مجھے خیال ہی نہ آیا کہ گارڈ بابو کی بیوی بننا تو آسان ہے۔ مگر یہ تفصیل تو ذرا بھاری خوراک ہے۔

"پھر بھی کیا کام کرتے ہیں، ریل میں تو ہزار سے زیادہ کام ہیں"

"اے —— ٹی ٹی —— قلی ——" میں ایسی بولائی کہ کچھ بن نہ پڑا۔ سامنے ایک قلی بڑا سا بنڈل، ایک بستر، آدھی درجن صراحیوں کی سیڑھی اور دو لوٹے لیٹے چلا آرہا تھا۔ اور ایسے بن رہا تھا جیسے بہت بھاری ہیں۔

"قلی —— تمہارا میاں قلی ہے" حیرت کا ایک دورہ ان پر بھی پڑا۔ میں چاہتی تھی ذرا ہم آہستہ آہستہ گفتگو کریں۔ ورنہ کہیں پہلی ہم سفر نہ سن لیں۔ ان کا بچہ سکون سے دودھ پی رہا تھا۔ مگر ایک دفعہ بات نکل جائے تو پھر بھی اس پر ہی جم جاتی ہوں۔ اور یہاں تو جمنے کے ویسے ہی لالے پڑتے تھے۔

"ہاں —— آں قلی ہی سہی پھر تمہیں کیا" میں نے ذرا برا مان کر کہا۔

"تمہارا میں —— میاں قلی ——"

"ہاں پھر —— تم کیوں جلو —— تمہارا جی چاہے تو تم بھی قلی سے کر لو —— دس

قلیوں سے کرو. کون روکتا ہے. اتنے تو سستے ہیں قلی." مگر میں ذرا چپ رہی اور مظلوم سی صورت بنالی.

بولیں: "کیسے ہو گئی تمہاری شادی قلی سے؟"

اور میں سوچنے لگی قلیوں سے کس طرح شادیاں ہوتی ہیں میں نے چاہا دل سے کچھ گھڑوں کسی شادی کا حال، مگر کسی قدر غیر دلچسپ معلوم ہوا.

پھر میں نے کہا: "ایک قلی تھا ——"

انہوں نے توجہ سے سنا.

"وہ رہا کرتا تھا ——" میں چاہتی تھی وہ میری ہر بات پر "ہوں" کریں. یا کم از کم سر ہلائیں.

"پھر کیا ہوا کہ ایک دن —— کہ ——" کاش مجھے معلوم ہوتا —— اس وقت کوئی قصہ بھی تو نہ یاد آیا.

"وہ لے جا رہا تھا سامان ——" میں نے چاہا وہ پوچھیں کس کا. اور انہوں نے پوچھا.

"ایک نہایت ہی خوبصورت لڑکی کا —— پھر وہ لڑکی —— وہ لڑکی عاشق ہو گئی."

"کون لڑکی؟"

ارے یہ تو معلوم ہی نہیں پڑا. خیر کیا مضائقہ ہے. کوئی بات نہیں. یقیناً ہو گی ہی کوئی لڑکی —— کوئی خوبصورت سی لڑکی ہو گی.

"تو وہ قلی پہ کیوں عاشق ہو گئی؟"

"وہ عاشق یوں ہو گئی کہ ۔۔۔ کہ ۔۔۔ ارے بھئی اب یہ کیا معلوم کوئی تو وجہ ہے ہی عاشق ہونے کی۔ وہ مسکرایا ہو گا اسے دیکھ کر۔" اتنے میں ایک نہایت بھیانک قسم کا بابو مجھے دیکھ کر مسکرایا اور میں ڈری کہ کہیں سچ مچ عاشق نہ ہونا پڑے۔ ابھی انٹرویو میں جانا ہے۔ سنتے ہیں عشق میں بڑی حالت خراب ہوتی ہے۔ بھلا پردیس میں کہاں عاشق ہوتی پھروں گی۔ تبسم بھائی کے یہاں جانا ہے اور وہ ہیضہ کے بعد بس عشق سے گھبراتے ہیں۔ خیر بات گذر ہی گئی ہو گی۔

"اے بہن یہ کیا کہہ رہی ہو ۔۔۔ کون لڑکی کس کا عشق۔ میں کہتی ہوں تمہاری شادی کیسے ہوئی؟"

"ہاں! ۔۔۔ ان بچاری کی شادی نہیں ہوئی۔" آخر کو پہلی مسافرہ کو پتہ چل ہی گیا نا کتنا مردی سے کہا آہستہ بوا، آہستہ ۔۔۔ مگر یہ لیجئے وہ قلی بھی ہاتھ سے گیا۔

"جب نہیں ہوئی تھی ۔۔۔" میں نے چاہا شاید مان جائیں۔

"اُوئی ۔۔۔ کیا ریل میں بیٹھے بیٹھے ہو گی۔"

کاش ایسا ہو سکتا۔ کاش گرما گرم چائے کی بجائے لوگ امیر امیر کماؤ شوہر بیچتے ہوتے، تو سفر کے لئے میں ضرور لے لیتی۔ پھر چاہیئے ۔۔۔ پھر دیکھا جاتا۔ اور میں نے ارادہ کر لیا کہ بھئی اب کے ایک مناسب قسم کا میاں ڈھونڈنا چاہیئے۔ اب اس میں کیا ٹوٹا ہے اپنا۔ ٹھیک ہی رہے گا۔ بلا سے ہر مسافر سے نئے نئے جھوٹ تو نہ

بولنے پڑیں گے کہ بھئی کسی نے پوچھا فوراً میاں حاضر۔

"ارے بھئی اچھے لڑکے کہاں ملتے ہیں"۔ وہ میرے مستقبل سے ناامید ہو کر بولیں۔

"موٹر مانگتے ہیں۔ گاڑی گھوڑا دو —— اور بھئی کماؤ ہوں جب ہی نا —— ایسے ملے جاتے ہیں کماؤ لڑکے"۔

میں رنجیدہ ہو گئی۔ آخر یہ کماؤ لڑکے کیوں نہیں ہوتے۔ کمبخت اچھے لڑکے پہلے زمانے میں کتنے ہوتے تھے، مولی گاجر کی طرح۔ پر اب چاہو کہ آنکھ میں لگانے کے لئے اچھا لڑکا مل جائے تو نہیں۔ اس لڑائی نے تو اجاڑ کر رکھ دیا۔ چلو بھئی پہلے لڑکے تو تھے، کماؤ تھے یا نکھٹو، پر اب تو جسے دیکھو لڑائی پر چلا آ رہا ہے لو صاحب یہاں تو بیویاں طعنے دے رہی ہیں اور لڑکے ہیں کہ مرنے کٹنے پر تلے ہیں۔

"تم پھر شادی کیوں نہیں کر لیتیں"۔ ایک بولی۔

"جیسے آپ کی مرضی"۔ میں نے اس معصوم لڑکی کی طرح دیکھا۔ جس سے والدین شادی طے کرنے کے بعد روشن خیال بننے کے لئے رائے لیتے ہیں۔

"کب کرو گی پھر اب نہیں کرو گی تو؟"

"اب —— یعنی ابھی —— میرے خیال میں —— تو۔ اگر جنکشن تک ٹھہر جاتے تو اچھا تھا۔

"کیا؟"

"یہی کہ —— جب آپ کی مرضی ہے تو پھر کیوں اس نیک کام میں دیر کی جائے"۔

"کیسا نیک کام؟ کیا کہہ رہی ہے لڑکی؟" بہت ہی گھبرا گیئں۔

"میں نے پوچھا بھئی شادی کیوں نہیں کرتیں تم" دوسری بولیں۔

"تم کیوں نہیں کرتیں شادی ــــ بس؟" میں اب کافی جل اٹھی تھی۔ حالانکہ ان کا بچہ مسلسل دودھ پی رہا تھا۔ مگر میں نے اسے نظر انداز کر دیا۔

"اُو ئی ــــ معلوم ہوتا ہے کہ دماغ بھی خراب ہے" وہ بچے کو اور واضح طور پر سامنے لائیں تاکہ یہ نہ معلوم ہو کہ وہ صرف گود میں سو رہا ہے۔

"تو اچھا تمہاری شادی ہو گئی ــــ کب کی تم نے شادی" میں نے بہت بےتکلفی سے پوچھا۔

"ہمارے ماں باپ نے کی ہماری شادی۔ ہم خود کیوں کرتے"

"تو آپ شادی کے خلاف ہیں ــــ ٹھیک ہے ــــ بالکل ٹھیک ــــ میرے ماں باپ نے شادی کی ــــ جاہل انسان!" اس کے بعد وہ کچھ مکدر ہو گیئں اور غمگین ہو کر ناشتہ دان میں سے امرتیاں نکال کر غم غلط کرنے لگیں۔

اے خدا تو جب دعائیں قبول کرنے پر آتا ہے تو یوں دعا قبول کرتا ہے؟ تیرے بندوں کو کسی کل چین نہیں۔ یہ تیری ناچیز بندی تنہا تھی۔ اس نے دوسرا یت چاہی تو تو نے یوں عذاب کی طرح مسافر نازل کرنا شروع کئے۔ اور مسافروں سے زیادہ اسباب۔ ویسے بھئی ہمیں کیا حق کہ بے بات تیری مصلحت میں دخیل ہوں۔ مگر پروردگار اتنا تو سوچا ہوتا کہ انسان میں تو نے جتنی برداشت دی ہے۔ اتنا ہی بوجھ لاد کہتے ہیں ہم تو بس۔

اور میں ڈری کہ اگر دعاؤں کے قبول ہونے کا یہی ڈھنگ رہا تو کہیں وہ شوہر کے لئے بھی جو ابھی ابھی دعا مانگی تھی اس کا بھی کچھ ایسا ہی قصہ نہ ہو اور لے چلا چل ایک پہ ایک! میرا تو دم ٹوٹ جائے گا! میں ایک ہی قمیض میں بٹن لگا دوں اور چائے بنا دوں تو بہت جانو. مجھ سے بھلا اتنے کاہے کو جھیلے جائیں گے. سست مٹی ویسے ہی ہوں. اب اتنے میاؤں کو کون میرے بیٹھ کے بھگتے گا. کہتے ہیں کہ ڈاک خانے میں اگر بھولے سے غلط خط پڑ جائے تو تھوڑی سی رشوت دے کر واپس لے سکتے ہیں. کاش دعاؤں کے معاملے میں بھی کچھ ایسا ہی انتظام ہوتا. مگر دعا ایک دفعہ مانگی جا چکی تھی اور پے در پے قبول ہو رہی تھی۔

نئی ہم سفر بہت ہی خلیق معلوم ہوتی تھیں اور ضرورت سے زیادہ رفیق القلب کچھ نازک سی شاعرانہ بیماری کچھ آہستہ آہستہ بولنے کی عادی۔ مجھے ان پر بے تاب پیار آنے لگا۔

"حیدر آباد جا رہی ہیں آپ" انہوں نے بڑے وثوق سے پوچھا۔ میں ڈری کہ انکار کروں گی تو خفا ہو جائیں گی۔ لہٰذا بڑی عاجزی سے انکار کیا اور بتایا کہ بمبئی جا رہی ہوں۔

"احمد آباد سے آئی ہوں گی. کس ہوشیاری سے وہ پرانی بوتلوں میں نئی دوا بھر بھر کر سر سہلا کر پلا رہی تھیں مگر ان کا چہرہ اس قدر رویا ہوا سا تھا۔ کہ دل دکھانے کی ہمت نہ پڑی۔

میں نے بتایا۔

"پڑھتی ہیں وہاں"

"جی نہیں! انٹرویو کے لئے جا رہی ہوں"

"میرے ایک چچا کے سالے کی خالہ بھی بمبئی میں رہتی ہیں ان سے ملئے گا"

میں نے وعدہ کرلیا۔ بھلا میں کہاں ان کے چچا کے سالے کی خالاؤں کو ڈھونڈتی!

"وہاں آپ کے والد والدہ ہیں"

"نہیں ——— میرے ...." بولنے ہی نہ دیا۔ خود بول لیں۔

"اچھا آپ کے شوہر ہوں گے!"

گھن! وہ دیکھئے گھما پھرا کر وہی ایک ٹانگ مرغے کی۔ شوہر ——— شوہر ہندوستان کے شوہر اس قدر مرکھنے ناکیں کاٹ لیں، طلاقیں دے دیں۔ بڑی مشکل سے ملیں اور ملیں تو نکھٹو! رنڈی بازی کریں، جوا کھیلیں مگر بیویاں ہیں کہ واری جا رہی ہیں۔ جسے دیکھئے شوہر کے ذکر میں غلطان، جسے دیکھئے اپنے یا پرائے شوہر کا رونا رو رہی ہیں۔ کنواریاں ہیں شوہر کے گیت گا رہی، بیاہیاں ہیں پریتم پر فدا اور یہ پریتم کتے خون تھکوائے دے رہے ہیں۔ ان مظالم معشوقانہ پر تو یہ حال ہے اگر ذرا لاڈ کر لیتے تو نہ جانے کیا ہوتا۔ میں نے سوچا میاؤں کے ظلم میں بھی کچھ مصلحت ہے۔

"کہاں رہتی ہیں آپ بمبئی میں ——— بچے ہیں آپ کے ———" میں تو سوچ میں پڑی تھی اور وہ میاں کے بعد بچوں پر اتر آئیں۔

"آہ" میں نے پلیٹ فارم پر کتے گنتے ہوئے کہا۔ یہ ریلوں کے ساتھ مسافروں سے زیادہ کتے کہاں سے آتے ہیں!

"آٹھ"

"ہاں ___ کیوں آپ کیوں بُرا مانتی ہیں، یقین نہ آئے تو آنکر گن لیجئے"

"اب میں راستہ میں کیسے آتروں ___ ہاں انشاءاللہ کبھی آنا ہوا میرا چچا کے سالے کی خالہ کے یہاں تو ___ خیر ___ مگر بہن معلوم تو نہیں ہوتا منہ سے ___"

"منہ سے معلوم ہی کیا ہوتا ہے؟" میں نے فلسفیوں کے انداز میں کہا۔ جب دنیا سے مجھے نفرت ہونے لگتی ہے اور ہر چیز نیم مردہ اور اداس سی معلوم ہوتی ہے تو میرے دماغ میں فلسفہ بھرنے لگتا ہے۔

"شادی کو کتنے برس ہوئے" انہوں نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

"چار برس تین مہینے اور ___"

"اور آٹھ بچے ___ اے بہن میں سمجھتی تھی چلو ہوں گے ___ مگر ___"

وہ بہت غم زدہ سی ہوگئیں۔ مجھے رحم آگیا مگر میں نے تہیہ کر لیا کہ کچھ ہو جائے اب اور نہیں دبوں گی ورنہ بچوں کے بعد یہ نواسے پوتے بھی میرے سر پر منڈھ دیں گی اور وہ بیویاں جو میرے حالِ زار سے واقف ہیں اونگھ نہ چکیں ___ پھر خواہ مخواہ لے دے پڑے گی۔ آٹھ بچوں سے ویسے ہی روح قبض ہوئی جا رہی تھی۔

"ہاں ہاں کہتی تو ہوں ___ آٹھ ___"

"ماشاءاللہ سب زندہ ہیں ___ مگر بہن یہ ہوئے کیسے"

"کیسے ہوتے ہیں، جیسے دنیا جہان میں ہوتے ہیں ویسے ہی ہوئے ہوں گے"

"میرا مطلب ہے ___ چار سال میں ___"

"ہاں میں سمجھی ــــ اچھا یہ معلوم کرنا چاہتی ہیں آپ تو ــــ یہ ہوا کہ کبھی دو کبھی تین ــــ اور ــــ"

"ہے ہے" وہ لرزیں۔ اور مجھے بُرا لگا کہ آخر یہ کون ہوتی ہیں برا ماننے والی۔ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے، آخر انہیں کیا چاہیے کوئی ایک بچہ دے چاہے ایک دم دس۔ وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ پچھلے ملاقاتی جاگ اٹھے۔

"سنا بہن ان کے دو دو تین تین ایک ساتھ ہوے ــ بچے" انہوں نے شکایت کی اور وہ گھبرا کر اپنے بچے گننے لگیں۔ کیونکہ سوائے بچوں کے انہوں نے کچھ نہیں سنا۔

"کیا قصہ ہے" دوسری بولیں۔

جب معاملہ خوب سمجھا دیا گیا تو تینوں بگڑ کھڑی ہوئیں۔

"ابھی کہتی تھیں شادی نہیں ہوئی" اور ابھی دو دو تین تین بچے ہونے لگے" ایک نے ڈانٹا۔

"میری کیوں نہ ہوتی شادی خدا نہ کرے۔ تمہاری ہی نہیں ہوئی ہوگی"

بات بگڑنے لگی۔ پاس سے ایک ٹکٹ چیکر گزرے یا جانے کون تھے نظر کیجیے تو ہر ریل کا نوکر ٹکٹ چیکر ہی سا لگتا ہے۔ میں نے جھک کر ان سے وقت پوچھا۔ وہ بتانے کے بعد مسکرانے لگے اور مسکراتے ہوئے چل دیئے۔

"تم تو کہتی تھیں اکیلی جا رہی ہو۔ اور یہ تمہارے ــــ"

"یہ میرا نواسہ ہے" قبل اس کے کہ وہ کوئی رومینٹک سا رشتہ قائم کرتیں میں نے خود ہی اپنے لئے فیصلہ کر لیا۔

"نواسہ؟" تینوں چیخیں۔

اللہ یہ آج ان لوگوں کو مجھ سے کہاں کا بیر پڑ گیا تھا کہ میرے کنبے کے ہر فرد کے ذکر پر بن بن کر چونک رہی تھیں۔

"کیا کہتی ہے لڑکی ——— یہ تیرا نواسہ کہ ———"

"تو آپ کو کیا؟"

"بہن بال تو سفید رکھے تھے ان کے" دوسری بولیں۔

"نزلہ سے ہو گئے ہوں گے" میں بڑبڑائی۔

اور پھر میں بالکل کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی۔ خودکشی کو دل نہ چاہا۔ چلتی ریل سے اترنے کی پریکٹس نہ کی۔ زمین سخت اور آسمان دُور۔

ہونہار بات ہو کر رہتی ہے۔ جب زائد سامان تلوا کر بلٹی دینے لگا تو کلرک نے کہا: "آپ کا نام ——— شوہر کا نام؟"

"چغد!" میں نے دانت پیس کر کہا۔

"چوکھے؟ ——— کیسا اونڈا نام ہے" اس نے متعجب ہو کر کلرک کے کہنی ماری۔

یہ بتانے کی شاید ضرورت نہیں کہ جب اس نے مجھے مسز چوکھے بنا کر رسید دی تو میں نے اس کے منہ پر اپنا بٹوا مع ایک عدد موٹی کتاب کے کھینچ مارا۔ اور یہ سب کچھ ہوا بس ایک شوہر کی خاطر!

لال چیونٹے

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔

اور اب بھی خزاں کے اختتام پر بور بھر کر پیڑوں پر سبز قمقمے ٹمٹمانے لگے ہیں، دوپہریں سنسان اور اونگھتی ہوئی جاتی ہیں۔ اور وقت کاٹے نہیں کٹتا تو پھر سے وہ بھولی بسری یادیں تازہ ہو کر دماغ میں چٹکیاں لینے لگتی ہیں۔

ایسی ہی ایک اجڑی ہوئی دوپہر کو جب لو کے جھکڑ آتشیں بھوتوں کی طرح فضا میں ناچ رہے تھے اور سڑکیں بیوہ کی مانگ کی طرح اجڑی اور خاک آلودہ ہو رہی تھیں۔ باسلیقہ انسان خس کی ٹٹیوں کی آڑ میں دبکے بیٹھے تھے۔

میں پچھل پائی بنی آم کے درختوں کے نیچے سر اٹھائے اس تاک میں گھوم رہی تھی کہ کوئی سیدھا سادھا درخت ہاتھ پڑ جائے تو یہ دوپہر اتنی غمگین اور دکھی نہ رہے میری بادیہ پیمائی بے کار نہ گئی۔ اور آن کی آن میں دوپٹہ اتار، میں جھاڑ جھنکاڑ ٹہنیوں میں ہرے ہرے قمقمے تلاش کرنے لگی۔ جھولی بھرنے سے پہلے ہی جی بھر آیا۔ اور میں نے ایک پیاری سی کیری کو.....

اس سے قبل کہ میرے بھو کے دانت سبز چادر کو چاک کر کے مدہوش کن سفیدی تک پہنچتے ایسا معلوم ہوا کہ سارے جسم پر بجلی کے ننگے تار لپٹ گئے۔ میں مفلوج سی ہو کر نیچے پھسلی اور دوسرے لمحے گھر والوں نے مجھے مرغ بسمل کی طرح زمین پر تڑپتے پایا۔

——— لال چیونٹے!

جب ذرا بدحواسی کم ہوئی تو میں نے دیکھا کہ جسم پر لال لال چٹے پڑ گئے تھے۔ ہر چٹے کے بیچوں بیچ ایک بھیانک چیونٹے کا لال لال سر یاقوت کی بوند کی طرح سلیقے پن سے ٹکا ہوا تھا۔ اس ہائے توبہ میں دھڑ تو جھڑ گئے تھے۔ مگر توبہ کیجئے کھوپڑیاں اسی ڈھٹائی سے دانت گاڑے ہوئے تھیں۔ معلوم ہوتا تھا چنگاریوں کی چادر جسم پر چپک گئی ہے۔

یہ بتانا بے کار ہے کہ اس کے بعد کتنے دن مرہم پٹی، پیپ، خون، چھپاتے ہوئے مرہموں سے دست و گریباں رہنا پڑا اور پکے آموں سے الگ ہاتھ دھونا پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی جب کہ بڑے بڑے معرکے سر کر ڈالے ہیں۔ زندگی کے انجن نے جی بھر کر بھرتا بنا دیا ہے۔ وہ دہکی ہوئی دوپہر دل و دماغ پر اپنی مکمل عفر تییت کے ساتھ کھڑی ہوئی ہے اور اسی یاد کا واسطہ دے کر ناظرین سے التجا ہے کہ خواہ آپ کی دوپہریں کتنی بھی اداس اور سنسان ہو جائیں۔ للّٰہ بھول کر بھی ایسی جگہ قدم نہ رکھئے گا۔ جہاں یہ خونی درندے اپنا خیمہ گاڑ چکے ہوں ....اور آپ بھی مسکرا رہے

ہوں گے کہ کتنی احمق ہوں ماشاءاللہ آپ بھی کوئی ننھے ہیں جو جلتی دوپہر میں آموں کی تلاش میں لال چیونٹوں سے الجھنے جائیں گے تو عرض ہے کہ دنیا بالکل گول مول ہے۔ قدم بڑھاتے وقت بعض وقت داؤپیچ میں اپنا ہی پیر کچل جاتا ہے۔ یہاں ہر وقت قدم پھونک پھونک کر دھرنا چاہیئے۔ کون جانے یہ لال چیونٹے آپ کی آستین میں سانپ بنے بیٹھے ہوں۔ اور کیا! کون جانے؟ کم از کم میں تو نہیں جانتی تھی۔ جبھی تو ایک اداس دوپہر کو پھر سے مجھے تنہائی اور بے کاری نے اکسایا۔ اور میں بیتے ہوئے واقعہ کو بھول کر دوبارہ لال چیونٹوں سے ٹکرا گئی۔ بات یوں ہوئی کہ ایک تھکی ہوئی سی شام کو جب تمام باسلیقہ انسان سی۔ بی۔ آئی اور ریس کورس میں تہذیب اور انسانیت کا بے نظیر وظیفہ دہرا رہے تھے میں بھٹکی ہوئی پچھل پائی کی طرح سر جھکائے اس تاک میں گھوم رہی تھی کہ کوئی سیدھا سادھا مشغلہ ہاتھ آجائے تو یہ شام اتنی نیم مردہ اور پریشان کن نہ رہے۔ ٹیکسی کا میٹر چڑھ رہا تھا۔ اور اس کے ساتھ میرے غصہ کا پارہ بھی اونچا ہوتا جا رہا تھا۔ ہر سینما حال کے آگے ڈراونے اشتہار دیکھ کر اور بھی جی بھن گیا۔ وہ اشوک کمار کی چھچھی جیسی ٹھوڑی، مہتاب کے ابلتے ہوئے ہونٹ، سورن لتا کا دق زدہ ڈھانچہ، دینا کا پہلوانی بازو، توبہ میری ایسی کونسی خطا ہو گئی جس کے جرم میں یوں عذاب دوزخ سے ڈرایا جا رہا ہے۔ ٹیکسی موڑ دو میں نے جھلا کر ڈرائیور کو ڈانٹا۔ کونے پر موٹر رکتے رکتے بچ کر رک گئی۔ سامنے ایک عجیب الخلقت اشتہار لگا تھا: امر ہندوستان ..... اکسیلسر..... عوامی تھیٹر۔ ان تین چیزوں نے بوکھلا کر رکھ دیا۔ یہ بھلا امر ہندوستان کون شے ہے؟ ضرور کوئی بھوتوں کا قصہ ہو گا۔

جی مجھے بھوتوں کے قصے بہت پسند ہیں۔ پتہ نہیں کیوں! ضرور کسی ممی کے افسانہ عشق کا جھگڑا ہوگا۔ ورنہ حضرت ہندوستان کو تو رحلت فرمائے کافی عرصہ ہوگیا۔ اور اب تو سڑ گل کر دوسرے ملکوں میں بطور کھاد کے استعمال کیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں ہندوستان تو بے شک بنجر ملک ہے۔ مگر اس کی کھاد بڑی زرخیز ثابت ہورہی ہے۔ میں زیادہ حیل وحجت کی قائل نہیں حکمائے اعظم کے اس بیان پر کہ ہندوستان مرچکا میں نے کبھی کا فاتحہ پڑھ ڈالا ہے۔ جب مرگیا تو واویلا سے کیا فائدہ۔ لاش پیٹنے سے کیا حاصل ہو۔ مرحوم کی روح کو اور عذاب ہوگا۔ بہتر تو یہی ہے اس سڑاندی لاش کو چٹ پٹ دفن کرکے دھوم دھام کا تیجہ کیا جائے۔ اور دوسرے زندہ ملکوں کی طرف منہ کرکے دل کو ڈھارس دے لی جائے۔ بھئی ہم نے تو اپنی سی سب کر دیکھی۔ دیکھئے نہ کمبخت ملک کی خاطر کیا کیا دکھ نہیں سہے۔ گو ویسے خود میں نے تو نہیں مگر ہاں میرے پیارے ملک کے احمق جانثاروں نے کیا کچھ نہ بھگتا۔ اور بھئی کیا میں بذاتِ خود بھگتتی تبھی کچھ ہوتا۔ ایسے کیا مجھ میں سرخاب کے پر لگے تھے کہ میری قربانی سے پھٹاک سے ملک آزاد ہوجاتا۔ ارے بھائی اس ڈھیٹ ملک کو آزاد ہونا ہوتا تو کسی نہ کسی طرح ہو ہی جاتا۔ اب کیا ضروری تھا کہ سب کے سب لپیٹ میں آجاتے۔ اور کیا، سچی بات تو یہ ہے کہ بھئی کچھ امید ہو تو کوئی کچھ کرے بھی۔ ہاں نہیں تو، ویسے ہی اوٹ پٹانگ کی قربانیاں کر بیٹھو۔ جیل سے بچے تو عمر جیلی یعنی سرکاری نوکریاں سرے سے غائب۔ بھئی نہ تو میں ایسی حماقتوں کی

طرفدار، اور نہ ہی قائل۔ اور کیا؟

ہاں تو میں نے کہا کیا ہرج ہے آج "امر ہندوستان" کا ڈھکوسلہ ہی چلے ارے ایسا بھی کیا ڈرنا کوئی بھوت تھوڑا ہی لپٹ جائے گا۔ دوسرے ایکسپرس یعنی دیسی ٹھرا" اور ایک دم تاج میں! کیا کچھ نہ معجون مرکب ہو گی! مگر لفظ "عوامی" سے ذرا جی کھٹکا۔ کیا کہے گا ٹیکسی والا کہ میم صاحب دیکھنے میں تو خاصی ہیں پر ہیں ذرا نچلے طبقے کی۔ خیر جی کڑا کر کے کہہ ہی دیا۔

دروازے پر سے ہی جی بیٹھنے لگا۔ قدم رکھتے ہی سامنے دو چار بچے کھچے گنجے حلیہ کے ہیولے منڈلاتے نظر آئے۔ دو تین پھوہڑ قسم کی لڑکیاں پروگرام بیچ رہی تھیں۔ دمینتی کو تو میں صاف پہچان گئی۔ پرلے درجے کی پگلی۔ ماشاءاللہ پوری آستین کا کرتہ گرمی کے زمانہ میں دانتوں سے نوچ کر نیم آستین بنا لیا جاتا ہے۔ کنارے ترپنے کی توفیق نہیں۔ اور چلی ہیں پروگرام بیچنے۔ ارے ایسا ہی تھا تو پوپیٹ والا کی لڑکیوں کو بلا لیا ہوتا۔ خدا کی قسم ٹامیوں تک کا پڑا اُکھڑ ڈالیں! بارہ آنے کا پروگرام پورے ایک روپے میں لے کر میں تو جلد ہی سے آگے بڑھی۔ ٹپ دینے کی کم بخت ایسی بری عادت ہو گئی ہے۔

ہال میں جا کر منہ اتر گیا۔ بس یہ سمجھئے بنگال کے قحط کا سماں کھنچا ہوا تھا۔ پراگندہ اکا دکا فلک کی ستائی صورتوں کے دو چار بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ ہے ہے یہ میں نے کیا حماقت کی۔ اس سے تو بھگت "پوڈا ناتا" ہی دیکھ آتی۔ خیر

کیا ہوا جی میں سوچا لوٹ چلوں کہ ایک دم سے میری نظریں لڑکھڑا کر رک گئیں سامنے تیسری کرسی پر راج بیٹھا ہوا دھوئیں کے بادلوں میں چھپنے کی کوشش کر رہا تھا۔

تو میری بادیہ پیمائی بیکار نہ گئی۔ دوسرے لمحے راج میرے برابر والی کرسی پر تھا۔ اور میں اس کے سگریٹ کے دھوئیں میں غلطاں اور پیچاں۔

لیجئے بسم اللہ ہی غلط پردہ اٹھا تو وہ چار ملگجے کپڑے پہنے اجڑے حلیے کے لوگ نظر آئے۔ نہ پوڈر نہ وڈور۔ نہ جھم جھماتے کپڑے۔ بس مسلی ہوئی دھوتیاں اور ڈھیلے ڈھالے کرتے۔ اور قومی ترانہ شروع ہوا۔

مجھے یاد ہے یہی ترانہ علی گڑھ کالج میں صبح ہی صبح گایا جاتا تھا۔ کیا سریلی اور لیٹی لیٹی لے ہوتی تھی۔ کہ گاتے میں جمائیاں آنے لگتی تھیں اور روز یہی جی چاہتا تھا کہ بس آج تو بجائے پڑھانے کے سب لڑکیوں کو نرم نرم تکئے دے کر ہال ہی میں پڑا رہنے کی اجازت دے دی جائے تو مزہ آجائے۔ شروع میں تو خیر مگر جوں جوں نغمہ تیز ہوتا گیا۔ دل کی حرکت بڑھتی گئی۔ آخر میں ایسا معلوم ہوا کہ دل و دماغ کی ساری کھڑکیاں کھولی ہی نہیں گئیں۔ بلکہ جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر توڑ ڈالی گئیں۔ جانو جیتے مار مار کے منایا جا رہا ہے کہ "ہندوستان ہمارا" گرج گرج کر چنگھاڑا جا رہا ہے کہ ایک دفعہ تو بہرکان بھی چیخ اٹھے۔ بھلا ان اللہ کے بندوں سے کس نے کہا ہوگا۔ کہ اتنی گرمی کے زمانہ میں ایسا بھڑکتا ہوا راگ رکھدو کہ دماغ

میں چڑ کے لگنے لگیں۔ اور جی بے بات ہلکان ہو جائے۔ عزیب راج ویسے ہی جذباتی ہے۔ اس کا سینہ اوپر نیچے ہونے لگا۔ پروگرام کا ورق الٹا۔

اندھیری گھپ اسٹیج پر لال لال بھوت اپنی پوری خباثت سے جھپٹا۔ نقارے کی چنگھاڑ سن کر سارے باز چونک اٹھے۔ غراتے لگے۔ نفیری چیخ اٹھی۔ اور ستار جھلانے لگی۔ سازوں کی فوج پکار پکار کر انسانوں کو پکارنے لگی۔ دم بھر میں جی دار ننگی تلواریں چمکاتے چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے۔ پرے کے پرے امنڈ کر دشمن پر الٹ پڑے۔ نپے تلے قدموں سے بڑھتے ہوئے تیکھی تیکھی نظروں سے گھورتے ہوئے۔ وہ سب کے سب نشانہ باندھ کر میری آنکھوں میں گھسنے لگے۔ مگر مجھے آنکھ جھپکانے کی ہمت نہ ہوئی۔ خدا خدا کر کے پردہ گرا اور میں نے جھنجھوڑ کر اپنے آپ کو جگایا۔ لاحول ولا قوۃ تین آدمی تو تھے ہی اسٹیج پر اور وہ بھی ٹڈوں جیسے سوکھے مارے، یہ میرے واہمہ نے انہیں تین ہزار بلکہ تین لاکھ کیوں بنا لیا اور تین ہی عورتیں تھیں۔ چھوٹی چھوٹی پھوڑے پھوڑے گالوں والی۔ مگر یہ ان کی آنکھوں میں کیا دہک رہا تھا۔ جیسے دبے گھٹے آتش فشاں کا نیلا نیلا دھواں!

جی چاہا گھبرا کر بھاگوں! مگر جیسے وہ مصنوعی تلواریں میرے جسم کے دو ٹکڑے کر گئی تھیں "بھاگ یہاں سے" پیر کہتے تھے۔

"ذرا ٹھہر!" دل نے پکارا۔ ان اعضاء کی تو تو میں میں سے ہلکان ہو کر میں اور بھی سہم گئی۔ پسینہ پونچھ کر میں نے راج کی طرف دیکھا۔ اور بالکل ہی لرز گئی

پردہ گر چکا تھا۔ مگر معلوم ہوتا تھا۔ اُس کی آنکھوں پر سے جلدی جلدی سینکڑوں پرت پردوں سے اٹھتے جا رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں ایک زہریلی بجھی ہوئی چمک تھی۔ اور ہزاروں ننگی تلواریں ناچ رہی تھیں۔ اس کا سینہ لوبھل بادلوں کی طرح اُبل اُبل کر دب رہا تھا۔

"راج!" میں نے اُس کے سینے پر ہاتھ رکھدیا۔ مگر جلد ہی اس بھونچال سے سہم کر میں دور ہٹ گئی۔ "راج" میں نے پھر پکارا۔

"کیا طبیعت خراب ہے۔"

"نہیں تو۔" اس نے اپنے آپ کو کسی دور دراز کی دنیا سے واپس کھینچ کر کہا۔ "گھر چلو گے؟"

"نہیں ۔۔۔ " اُس نے ڈانٹ بتائی۔ "توبہ ہے۔ لعنت ایسے تماشہ پر کہ جی ہلکان ہو جائے۔" یہ الٹے ہاتھ پر شانتی تھا۔ اور سامنے پریم ۔۔۔ "میں ان سب کو جانتا ہوں۔" اس نے فخریہ کہا گویا ان سب کو جاننا ہی مقصد زندگی ہو۔

"وہ سجن شنکر تھا۔ اودنے کا رشتے کا بھائی!"

"ارے وہ لمبوترا سا۔"

"وہ لمبوترا سا قطعی نہیں تھا۔" اے لو۔ راج بُرا مان گیا۔ "وہ بہت خوبصورت ہے۔" "ضرور ہوگا۔" میں نے جل کر کہا۔ "مگر اودے شنکر کا بھائی! خوب کماتا ہوگا۔"

"وہ کچھ بھی نہیں کماتا۔ گویا کچھ بھی نہ کمانا بڑے کمال کی بات ہے۔" چالیس روپیہ ملتے ہیں۔

"روز؟ ۔ ۔ ۔ ۔ تو اور کیا کسی کا سر لے گا۔"

"جی نا ـــــ روز نہیں، مہینہ بھر میں۔"

"ارے۔ اور او دے شنکر اسے کچھ نہیں کہتا۔"

پروگرام کا دوسرا ورق الٹا۔ مگر میں ان احمق نوجوانوں کے متعلق ہی سوچتی رہی۔ آہ! یہ ہونہار، یوں مٹی میں عاقبت رلا رہے ہیں۔ ارے صاحب یہی تو وقت ہے کمانے کا۔ اور کچھ نہیں تو کسی فلم کمپنی ہی میں چلے جائیں۔ دیکھئے نا کیا بھیانک ناچ فلموں میں ہوتا ہے اور لاکھوں مل جاتے ہیں اس سے تو لچھو مہاراج ہی زیادہ عقلمند ہے۔ مزے سے ایک ناچ سیکھ لیا ہے۔ بس اسی کے ذریعہ ہزاروں کما رہا ہے۔

میں نے چونک کر راج کو دیکھا۔ وہ آتش فشانی کیفیت غائب کر کے مجسم شعر بنا بیٹھا تھا۔ اسٹیج پر رنگ برنگی چڑیاں سر تال پر پھڈک رہی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا۔ وہ ساز پر نہیں ناچ رہی ہیں۔ بلکہ یہ میٹھے میٹھے سر ان کی نازک نازک حرکتوں سے ٹپک رہے ہیں۔ ان کی ہر لرزش جھنکار بن کر فضا کو مرتعش کرتی ہوئی چھوٹی چھوٹی لہروں کی صورت میں دل پر چھاتے جا رہی تھی۔ ننھی ننھی ہزاروں گدگدیاں سی دماغ کی رگوں میں رنگینی احساس کو ڈاگے دے رہی تھیں۔ اور راج ـــــ؟

راج بے حس تھا۔ مگر معلوم ہوتا تھا۔ اس کا وجود ناچ رہا ہے۔ اس کی آنکھیں بھڑک رہی تھیں۔ اور تھوڑی دیر کے لیئے مجھے ڈر لگنے لگا۔ کہ کہیں یہ عوامی جھمیلہ مجھے پسند نہ آجائے۔

"کیا یہ بھی اسی کمپنی میں نوکر ہیں۔" ختم ہوتے پر میں نے پوچھا۔

"نوکر نہیں، یہی مالک ہیں۔"

"خیر ہوں گی۔" میں نے جل کر کہا۔ مگر چالیس روپیہ میں تو۔ ۔ ۔ ۔"

اور راج نے لمبا چوڑا لکچر دے ڈالا۔ نہ جانے کیا کیا۔ مگر میں سوچتی رہی۔ پاگل ہیں۔ یہ لڑکیاں۔ ذرا دیکھئے نا فلم میں کیوں نہیں چلی جاتیں۔ کیا ایک سے ایک ٹیڑھی نکونی بھینگی ہیروئن بھری پڑی ہے۔ اور ایک سے ایک زیادہ کما رہی ہے اور ان چھ لڑکیوں کی حماقت سے مجھے لاکھوں کا قومی نقصان ہوتا نظر آیا جبھی تو ہندوستان اتنا غریب ہے۔ جدن باٹی کو دیکھئے خدا کے فضل سے آج اپنی ذاتی کمپنی کی مالک ہیں۔

اس کے بعد "مقدس رقص" شروع ہوا۔ ارے تو اچھا بھلا رقص کا فن جانتے ہوئے یہ لوگ اتنے احمق کیوں ہیں؟ کم از کم یہ رقص تو کسی طرح بھی معمولی نہ تھا۔ یہ دیکھ کر کچھ ہتک سی محسوس ہوئی۔ کہ اس عوامی تھیٹر میں اس قدر شاندار فن کہیں سے اڑا لیا گیا ہے۔ کس قدر دسترس ہے۔ اور وہ کمبخت طوطے کی شکل والا نو کیا جسم کو مروڑتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ مجھی کو اٹھا اٹھا کر پٹخنیاں دے

رہا ہے اور اب جسم کے پرزے اڑے اور اب اڑے۔

میں تو پختہ ارادہ کر کے آئی تھی کہ یہ پست طبقے کا تماشا پسند کرنا ایک سرے سے مجھے راس ہی نہیں۔ میں اسے سراسر تضیع اوقات سمجھتی ہوں۔

"یہ کون ہے دھوبی کی شکل کا؟"

"ہنہ یہ بنوٹے ہے۔" راج نے ایک لمبا سا لکچر شروع کر دیا۔ اور میں ہنسنے لگی۔ کتنی مضحکہ خیز شکل ہے معلوم ہوتا ہے۔ کلوا دھوبی نے گاندھی جی کی آنکھیں چرا کر لگا لی ہیں۔ جب گاتا ہے تو اور بھی غیر انسانی سا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے چہرے پر نغمہ کی باریک لڑیاں بکھر جاتی ہیں۔ اور معلوم ہوتا ہے گلے میں تو سازوں کا خلاصہ نچوڑ کر بھر رکھا ہے۔

"یہ کون ہے گول مٹول ریوڑی سی؟"

"یہ پرہیتی سرکار ہے۔" راج نے اس قدر میٹھی مسکراہٹ سے کہا کہ میرا جی کڑوا ہو گیا۔ میں سوچنے لگی۔ راج کو آج ہی وہ سونے کے بٹنوں کا سیٹ پریذنٹ کرنا پڑے گا۔

"اور وہ کون ہے؟" میں نے کیوپڈ جیسے گھنگریالے سر اور مونالزا جیسی آسمانی مسکراہٹ میں ڈوبے ہوئے چہرے کو دیکھ کر پوچھا۔

"یہ ردی داہے۔ اودے شنکر کا چھوٹا بھائی۔" اور میں سوچنے لگی کہ اودے شنکر کا پورا خاندان کسی مہلک مرض میں مبتلا معلوم ہوتا ہے۔

اور یہ ہر ساز سے مذاق کر رہا ہے۔ ابھی طبلہ ہے تو ذرا سی دیر میں ستار

دو گھڑی بعد جا نجن سے چھیڑ چھاڑ اور پھر بانسری سے ٹھنکارے۔ آدمی ہے کہ سازوں کا جمعدار۔ توبہ۔

ہاں تو بات کہاں سے جا پہنچی۔ میں کیا کہہ رہی تھی جی کہ وہ لال چیونٹے مجھے احمق نہ سمجھئے میں اوٹ پٹانگ کہنے کی عادی نہیں۔ پروگرام کا آخری صفحہ شروع ہوا۔ اختتام پر وہی بھولی بسری دہکتی ہوئی سنسان دوپہر جب میں کچے آموں کے لالچ میں پیڑ پر چڑھ گئی تھی۔ اپنی پوری ہولناک تباہیوں کے ساتھ دہرائی جانے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے لال چیونٹوں کی فوج نے دل و دماغ پر حملہ بول دیا۔ بھیجے کی رگوں میں ڈنک سے چبھے اور زہر پھیلتا چلا گیا۔ ہوا میں چاروں طرف سے غیر مرئی چانٹے گھومنے لگے۔ احساس پٹاخوں کی طرح چٹخنے لگا۔ جونہی پردہ گرا میں نے اپنے آپ کو ٹیکسی میں ہانپتے کانپتے ڈرائیور کو جلدی چلنے کی التجا کرتے پایا۔ جیسے میرے پیچھے بھوتوں کے غول بھاگے چلے آرہے ہوں۔

وہ دن اور آج کا دن خواہ کچھ بھی ہو۔ کتنی بھی اداسی اور تنہائی چھائی ہوئی ہو۔ زندگی کتنی بھی سُستی سے گھسٹ رہی ہو۔ میں اپنے پُرامن بِل سے نہیں نکلتی اور آج میں نے سوچا کہ میرا فرض ہے خلق خدا کے بھلے کے لیے آگاہ کردوں۔ اور آپ کو خدا کی قسم یہ مضمون ضرور پڑھیے گا۔ اس سے لاکھوں کا بھلا ہوگا۔ دیکھئے وہ جو میں نے زمانۂ ماضی چند احمقانہ چیزیں لکھ دیں۔ انہیں بھول جائیے۔ اب میری کایا پلٹ گئی ہے۔ اور لوگوں کی فلاح بہبود ہی میرا دین و ایمان ہے۔ لہٰذا جاگیے اور کانوں میں سے روئی کی گولیاں نکال پھینکئے ہتھیار اٹھائیے اور جی توڑ کر دشمن کا مقابلہ کیجیے۔ ورنہ وہی ہوگا۔ جو روس میں

ہوا۔ اور جس کے خلاف تمام مہذب قومیں ہتھیار اٹھا چکی ہیں یا اٹھا رہی ہیں اور اب تک اٹھاتی رہیں گی۔ اٹھئے، مہذب قوموں کا ساتھ دیجئے۔ ورنہ یہ برسوں کی گھنی گھنائی تہذیب کا نظام ڈگمگا جائے گا۔ یہ صدیوں کے مقدس اصول بکھر جائیں گے۔ عرشِ تمدن کے کنگورے اپنی جگہ چھوڑتے جا رہے ہیں۔ علم و ہنر کو عوام کے غلیظ پیروں تلے کچلنے کے لیے پھینکا جا رہا ہے۔ یہ لال چیونٹے دبے پیر سر جھکائے دھاری دار نیزوں جیسے ڈنک بڑھائے چپکے چپکے ہمارے نظام کی طرف رینگ رہے ہیں۔ آنکھ جھپکی تو یہ غلیظ سڑکوں کے کیڑے جسم کو چاٹ کر کھوکھلا کر دیں گے۔ یہی ناچ رنگ جو آج یہ لوگ تماشہ کہہ کر دکھا رہے ہیں۔ ایک دن تگنی کا ناچ نہ نچا دے تو میرا نام پلٹ کر رکھ دیجئے گا۔ اس تماشہ کے خاتمہ پر جو کچھ میں نے دیکھا وہ حقیقت کا لباس نہ پہن لے ورنہ یقین مانئے جارجٹ اور مخمل خواب ہو جائیں گے۔ اور شرفا بھی عوام کی طرح ننگے ہو جائیں گے۔ دیکھئے نا ہماری ملوں میں اتنا کپڑا کہاں سے آیا کہ یہ اتنے ننگے جسم ڈھانک دیئے جائیں اور اگر کوشش بھی کی گئی تو رہی سہی شرافت بھی خاک میں مل جائے گی۔ یہ دو چار بچارے خوش پوش ملک اور قوم کی عزت بنائے بیٹھے ہیں، یہ بھی نہ رہیں گے۔ وہی گاڑھا گزی باہر والے ہنسیں گے۔ وائٹ اوے کا کیا ہوگا؟

رسیال اور بھگومل کہاں جائیں گے۔ اگر آپ یونہی سوتے رہے تو وہ دن دور نہیں جب سب کچھ تباہ ہو جائیگا۔ دیکھئے یہ لال چیونٹے ابھی ایک باریک سی قطار میں گزر رہے ہیں۔ ایسا نہ ہو چپکے چپکے یہ قطار قطاروں میں تبدیل ہو جائے۔

گو یہ تو اطمینان ہے کہ ان کی بہنیں اسکولوں میں نہیں اور ہمارے بچے مزے سے صحیح تاریخ رٹ رٹ کر بڑے بڑے عہدے حاصل کر رہے ہیں۔ ان کا اخبار نہ ہی دلچسپ اور چیپا ٹا۔ خشک کاغذی چیتھڑا جس کی اشاعت مست قلندر سے دس گنی کم ہے۔ جو اتنا ردی چھپتا ہے کہ ردی کاغذ کی جگہ استعمال کرو تو کالک چھوٹنے لگتی ہے۔ مگر یہ نئی چال جو عوامی تھیٹر کی آڑ لے کر چل رہے ہیں۔ کافی سے زیادہ خطرناک ہے۔ ذرا چھورا اپن دیکھئے ان کا تماشہ کہہ کر ڈگی بجا کر بلاتے ہیں۔ اور وہاں خود آپ کا بھیانک اور مضحکہ خیز ہیولہ بنا کر نچانے لگتے ہیں۔ ذرا سوچئے تاقص، دیوتاؤں کی دو رنیا ہے کیا یہ جائز ہے کہ اسے تاریخ کا کچومر بنانے کے لیے پست کیا جائے "امر ہندوستان" میں صاف ان لوگوں نے یہ یقین دلانے کی کوشش کی ہے۔ کہ انگریز بحیثیت سوداگر آئے اور چٹکیوں میں ہندوستان کا سوداگر بیٹھے حالانکہ میں نے آٹھویں جماعت میں صاف صاف پڑھا تھا کہ بیچارے انگریزوں نے کافی سے زیادہ انکار کیا مگر مجبوراً قسمیں دے دے کر ہندوستان ان کے سر مڑھ دیا گیا۔ سو غریب اسے اب تک بھگت رہے ہیں۔ حالانکہ دنیا جانتی ہے کہ یہ کتنی شریف اور راست باز قوم ہے۔ ہندوستان کی خاطر یہ لوگ کیا کیا دکھ نہیں اٹھاتے حضور گورنر جنرل اپنا اچھا خاصہ ملک اجاڑ کر یہاں دوزخ جیسی گرمی برداشت کرنے تشریف لاتے ہیں۔ یہ کیا کچھ کم ہے۔ اور پھر پارٹیاں کھانے اور گوٹے کے ہار پہننے کے لیے کتنی کتنی دور جانا پڑتا ہے۔ بیچاری ملکہ وکٹوریہ تو خود دلی تک آگئیں چیلوں کے بیٹھنے کے لیے اپنا مجسمہ تک لگوا دیا اور اس سے زیادہ کوئی کر بھی کیا سکتا ہے

خاص طور پر ایسے صنعتی ملک کے لئے جہاں لوگ زبردستی کال ڈالنے کے عادی ہوں اب یہی دیکھئے نا بنگال میں لاکھوں مر گئے مگر کاہلوں سے اتنا نہ ہو سکا۔ کہ کما کھاتے۔ اور تو اور سنا ہے ہوٹلوں کے باہر پڑے مرتے رہے اندر جانے کی تکلیف گوارا نہ کی۔ کیا کلکتے میں ہوٹلوں کی کمی ہے۔ بھئی یوں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہو گے تو آپ کو بھوک لگے گی یا کنواں پیاسے کے پاس جاتا ہے یا پیاسا کنوئیں کے پاس اور وقت کی پابندی تو ہم ہندوستانیوں کو کبھی اور نہ آئے گی۔ وقت پر نہ کھانے سے بھوک بھی مر جاتی ہے۔ اور بھوک مر جانے سے آدمی آپ ہی مر جائے گا۔ اگر آپ نے اس زمانے میں ذرا سا بھی فائدہ کمایا ہے تو آپ کو قطعی یہ تماشہ نہ دیکھنے جائیے گا۔ خواہ مخواہ ان لوگوں کی بدمذاقی کی وجہ سے آپ کے دل کو ٹھیس لگے گی۔ یہ حاسد کسی کا فائدہ ہوتے نہیں دیکھ سکتے۔ کسی نے محنت مزدوری سے چار پیسے کمائے اور ان کے کلیجے میں آگ لگی' اور یہ دنیا کا قاعدہ ہے کہ زیادہ تر معصوم منافع خوروں ہی کو بدنام کرتی ہے لوگ انہی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔

اب یہی دیکھتے نا اسی ہزار کے نوٹوں والی بدمذاقی میں سوائے کنگال اور بھک منگوں کے اور کون پھنسا ہو گا۔ بیچاروں کو ہزار ہزار کے نوٹ چار چار تین تین سو میں بیچنا پڑے۔ ذرا حساب لگائیے تو معلوم ہو گا کہ ایک کنگلے کو کم از کم لاکھوں کا نقصان اٹھانا پڑا۔ اور پھر لوگ شور مچاتے ہیں کہ ہندوستان میں گداگری کی لعنت ہے۔

یہ لوگ ہاتھ دھو کر کالے بازار کے پیچھے پڑے ہیں۔ کبھی بزنس کی ہو تو کالے

گورے کا پتہ چلے۔ یہ بزنس مذاق نہیں کہ اٹھے اور ناچنے لگے۔ اکنومکس کے بارے میں الف کے نام لٹھ نہیں آتا اور چلے ہیں تنقید یں کرنے! یہ تو شاید بالکل ابتدائی جماعتوں میں سکھایا جاتا ہے کہ رسد کم ــــ مانگ زیادہ۔ مانگ کم رسد کے پو بلد سے ایک عقلمند انسان چاہے تو ایک من چاول سے اتنا کما سکتا ہے۔ کہ ایک احمق ایک من سونے سے بھی نہیں کما سکتا۔ صاحب! یہ تو بزنس کے گر ہیں۔ اگر ہمارے قوم کے بیوپاری اس وقت رسد کنٹرول نہ کرتے تو آج اتنی اطمینان بخش مانگ ہرگز نہ ہوتی۔ اجی چاول یہی بھوسے کے بھاؤ بکتا۔

اگر آپ یوں ہی غافل رہے تو وہ دن دور نہیں جب ہندوستان میں بھی وہی ہوگا۔ جو دوسرے ذلیل ملکوں میں ہو رہا ہے۔ خواہ آپ کو کتنی بھی شستی نفا رہی ہو۔ کام ضرور کرنا پڑے گا۔ آپ کے پیارے بچے یتیم خانوں میں چلے جائیں گے۔ اور بیوی سرکاری طوائف بن جائے گی۔ جی ہاں یہی ہوگا۔ چاہے پوچھ لیجئے۔ بڑے بڑے لیڈروں سے سب یہی کہتے ہیں۔ اور کیا! اور میں کہے دیتی ہوں کہ یہ لال چیونٹے تہذیب اور تمدن ہی نہیں بلکہ موجودہ سرکار کے خلاف بھی لوگوں کو بھڑکاتے ہیں۔ یہ سب انگریزوں کے پٹھو ہیں۔ اُنہیں پتہ نہیں بھئی یہی کہتے ہیں لوگ کہ سرکار برطانیہ نے بڑے غور و خوض کے بعد ان لوگوں کو اپنے خلاف پروپیگنڈہ کرنے کے لیے مقرر فرمایا ہے۔ کیا پتہ بھئی! لوگ ہی کہتے ہیں۔ کچھ ہوگا۔ جبھی تو دنیا کہتی ہے۔ بڑے بڑے لیڈر کہتے ہیں۔ تو کیا خدانخواستہ مذاق کرتے ہیں۔

یہ میل کے قائل ہیں۔ صاف بات اس گھمس کی گرمی میں تو میں کسی سے
ملنا حماقت سمجھتی ہوں۔ کہاں یہ کہتے ہیں ایک ہو جاؤ یا ذرا سوچیے اگر ایک
موٹے سے بٹنے میں ایک سو کھا مارا مسلمان گھول دیا جائے۔ تو کتنا بڑا ڈھیر
ہو جائے گا۔ ابل نہ پڑے گا مادہ؟ اس گرمی کے موسم میں چپچپاتے پسینے میں غرق
ـــــ جی چاہتا ہے۔ بس چلے تو اپنے ہی جسم کو چیر کر آدھا کر ڈالیں نہیں بھئی
میں کچھ بچ سے بہت ڈرتی ہوں۔ دوسرے ہندو مسلمان کا جوڑ ہی کیا۔ بھلا آگ
اور پانی کا بھی میل ہو سکتا ہے۔ اگر مل بھی جائیں تو نتیجہ؟ بھاپ! اللہ توبہ
بھاپ کی سینہ زوری سے کون واقف نہیں۔ اس ٹھنڈے انجن میں بس
بھاپ کی کسر ہے اگر غلطی سے پوری ہو گئی۔ تو بس لوگ منہ پھاڑے دیکھتے رہ
جائیں گے۔ اور یہ ہیبت ناک انجن اس جگمگاتی دنیا کو روندتا سرمست ہاتھی
کی طرح دندناتا اللہ جانے کہاں جا کر دم لے گا۔

لہذا ابھی وقت ہے جاگیے اور اپنی پوری طاقت لگا کر اس خونی فرقے
کا مقابلہ کر ڈالیے۔ ان کے بل معلوم کیجیے اور تیز سے تیز فلٹ کا نسخہ ایجاد کر کے
استعمال کیجیے۔ یہ ویسے نہ ملیں گے۔ ان جراثیم کی تلاش میں آپ کو اچھے بھلے
تندرست جسم چیرنا پڑیں گے۔ ہزاروں ناموں اور کاموں کی آڑ میں چھپے
یہ اپنا زہر پھیلا رہے ہیں۔ کہیں یہ اخباروں کے اوراق میں دبکے بیٹھے ہیں تو کہیں
ادب کی ٹٹی کی آڑ لے رکھی ہے، کہیں تھیٹروں کا ڈھونگ رچائے نرت اور سنگیت
کے ذریعے کانوں میں زہر گھول رہے ہیں تو کہیں پردۂ سیمیں کے نیچے سماج

کے حق میں دیمک بن کر رینگ رہے ہیں۔

انہیں ڈھونڈھ نکالئے۔ ہوشیاری سے ہتھنے پھیلا کر ہونگھئے۔ ان کی بساند ملک کے کونے سے خود دوڑی آئے گی۔ اور بس ناک کی سیدھ میں دوڑ کر انہیں پکڑ لیجئے اور پھر - - - - - انجمنیں قائم کیجئے، جلسے کیجئے، لکچر دیجئے، ریزولیوشن پاس کرائیے۔ ان کے خلاف پروپیگنڈے کا ایسا جال بچھائیے کہ قدم قدم پر منہ کے بل گریں، ان کے اخبار جلا دیجئے، پریس بند کرا دیجئے، ان کی پیشانیوں پر سرخ لوہے سے بالشویک داغ دیجئے، یہ سب بالشویک ہیں۔ گویا جانتے نہیں، ان کی تحریروں پر دفعات لگائیے۔ مقدموں کے ذریعے پٹخنیاں دے کر پست کر ڈالیے۔ تاج شاہی کی مدد لے کر کچہریوں میں گھسیٹئے۔ اور یہ جہاں ملیں جب ملیں ان کو تباہ کر دیجئے۔ اگر غلطی سے یہ عوامی تھیٹر آپ کے شہر میں پروگرام پیش کرنے آئے تو تمام با اثر رؤسا، علماء دین اور سرکاری افسروں کی مدد حاصل کر کے اس کا مقصد تہ و بالا کر دیجئے، ہال کے باہر پکٹنگ کیجئے اور اندر دنگا مچائیے۔ اسٹیج پر اینٹیں اور پتھر پھینکئے اور اتنا ادھم مچائیے کہ طبل جنگ کی پکار وہیں نیم مردہ ہو کر سسکنے لگے۔ ورنہ یاد رکھئے اگر یہ خونی گرج ایک بار نئی پود کے کچے کانوں میں گونج گئی۔ تو وہ اسے برداشت نہ کر سکیں گے۔ اور آج جو تلاطم میں نے راج کے سینے میں مچلتے دیکھا ہزاروں معصوم سینوں کو تہ و بالا کر دے گا۔ وہ ننگی تلواریں جو آج میں نے راج کی آنکھوں میں ناچتی دیکھیں لاکھوں شریف آنکھوں میں جگمگا اٹھیں گی۔

میں آپ کو بتائے دیتی ہوں کہ یہ بات ہنسی میں ٹالنے کی نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ اس وقت تو آپ مجھ کو احمقوں کی فہرست میں لٹکا دیں اور پھر ایک وقت ایسا آئے کہ آپ کو دستِ تاسف ملنا پڑے، پھر کچھ نہ ہو سکے گا۔ چڑیاں کھیت کا کھلیان کر چکی ہوں گی۔ اور وقت لہراتے ہوئے سانپ کی طرح بغیر لکیر چھوڑے بھاگ چکا ہوگا۔ پھر اس وقت آپ کتنا ہی پچھتائیں، نادم ہوں۔ مجھے یاد کریں، میرا مجسمہ بنوا کر شاہراہ عام پر کھڑا کر دیں۔ کچھ بھی نہ ہوگا۔ کیونکہ دیکھئے اگر یہ لال چیونٹے موجودہ نظام کے جسم کو ایک دفعہ لپٹ گئے۔ تو اس جنم میں تو نہ چھوڑیں گے۔ اور پھر یہ بھیانک زخم کسی مرہم سے پُر نہ ہو سکے گا۔

لیکن اگر عوامی تھیٹر کسی نہ کسی طرح اپنا پروگرام دکھانے پر تل ہی جائے۔ تو خبردار ٹکٹ ہرگز نہ خریدیئے گا۔ اور نہ کسی کو خریدنے دیجئے گا۔ ہاں اگر مفت کا پاس مل جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ کیونکہ پروگرام ان کمبختوں کا واقعی ذرا دلچسپ ہے۔ خاص طور پہ تپی سرکار کی روپہلی ندی کی طرح لہراتی، بل کھاتی تھرکتی، اٹھلاتی آواز۔ بنوے کی اتھاہ سمندر جیسی گہری گونجتی گرجتی ابھرتی ڈوبتی تانیں، اور ریتا کی برساتی جھرنوں کی طرح چھم چھم کرتی میٹھی میٹھی مرکیاں تھوڑی دیر کے لیے انسان کو ..... لاحول ولاقوۃ میں پروگرام پسند کرنے لگی!

چوتھی کا جوڑا

سہ دری کے چوکے پر آج پھر صاف ستھری جازم بچھی تھی۔ ٹوٹی پھوٹی کھپریل کی جھریوں میں سے دھوپ کے آڑے ترچھے قتلے پورے دالان میں بکھرے ہوئے تھے۔ محلے ٹولے کی عورتیں خاموش اور سہمی ہوئی سی بیٹھی ہوئی تھیں جیسے کوئی بڑی واردات ہونے والی ہو۔ ماؤں نے بچے چھاتیوں سے لگا لیئے تھے۔ کبھی کبھی کوئی منھنی سا چڑچڑا بچہ رسد کی کمی کی دہائی دے کر چلّا اٹھتا۔

"نائیں نائیں میرے لال" دبلی پتلی ماں اسے اپنے گھٹنے پر لٹا کر یوں ہلاتی جیسے دھان کے چاول سوپ میں پھٹک رہی ہو۔ اور بچہ ہنکارے بھر کر خاموش ہو جاتا

آج کتنی آس بھری نگاہیں کبریٰ کی ماں کے متفکر چہرے کو تک رہی تھیں۔ چھوٹے عرض کی ٹول کے دو پاٹ تو جوڑ لیئے گئے تھے۔ مگر ابھی سفید گزی کا نشان

پیونتے کی کسی کو ہمت نہ پڑتی تھی۔ کاٹ چھانٹ کے معاملہ میں کبری کی ماں کا مرتبہ بہت اونچا تھا۔ ان کے سوکھے سوکھے ہاتھوں نے جانے کتنے جہیز سنوارے تھے، کتنے چھٹی چھوچھک تیار کئے تھے۔ اور کتنے ہی کفن بیونتے تھے۔ جہاں کہیں محلہ میں کپڑا کم پڑ جاتا تھا، اور لاکھ جتن پر بھی بیونت نہ بیٹھتی، کبری کی ماں کے پاس کیس لایا جاتا۔ کبری کی ماں کپڑے کی کان نکالتیں، کلف توڑتیں، کبھی تکون بناتیں کبھی چوکھونٹا کرتیں۔ اور دل ہی دل میں قینچی چلا کر آنکھوں سے ناپ تول کر مسکرا پڑتیں!

"آستین اور گھیر تو نکل آئے گا۔ گریبان کے لئے کترن میری بقچی سے لے لو"

اور مشکل آسان ہو جاتی۔ کپڑا تراش کر وہ کترنوں کی پنڈی بنوا کر دیتیں۔

پر آج تو سفید گزی کا ٹکڑا بہت ہی چھوٹا تھا۔ اور سب کو یقین تھا کہ آج تو کبری کی ماں کی ناپ تول ہار جائے گی۔ جب ہی تو سب دم سادھے ان کا منہ تاک رہی تھیں۔ کبری کی ماں کے پر استقلال چہرے پر فکر کی کوئی شکل نہ تھی، چار گرہ گزی کے ٹکڑے کو وہ نگاہوں سے بیونت رہی تھیں، لال ٹول کا عکس ان کے نیلگوں زرد چہرے پر شفق کی طرح پھوٹ رہا تھا۔ وہ اداس اداس گہری جھریاں اندھیری گھٹاؤں کی طرح ایک دم اجاگر ہو گئیں، جیسے گھنے جنگل میں آگ بھڑک اٹھی ہو۔ اور انہوں نے مسکرا کر قینچی اٹھالی۔

محلہ والیوں کے جمگھٹے سے ایک لمبی اطمینان کی سانس ابھری، گود کے بچے ٹھسک دیئے گئے۔ چیل جیسی نگاہوں والی کنواریوں نے لپاجھپ سوئی کے

ناکوں پو ڈورے پرو دیئے۔ نئی بیاہی دلہنوں نے انگشتانے پہن لیے۔ کبریٰ کی ماں کی تینچی چل پڑی تھی۔

سہ دری کے آخری کونے میں پلنگڑی پر حمیدہ پیر لٹکائے ہتھیلی پہ تھوڑی رکھے دور کچھ سوچ رہی تھی۔

دوپہر کا کھانا نمٹا کر اسی طرح بی اماں سہ دری کی چوکی پر جا بیٹھی ہیں اور بقچی کھول کر رنگ برنگے کپڑوں کا جال بکھیر دیا کرتی ہیں۔ کونڈھی کے پاس بیٹھی برتن مانجھتی ہوئی کبریٰ کن انکھیوں سے ان لال کپڑوں کو دیکھتی تو ایک سرخ چھپکلی سی اس کے زردی مائل مٹیالے رنگ میں لپک اٹھتی۔ روپہلی کٹوریوں کے جال میں جب پولے پولے ہاتھوں سے کھول کر اپنے زانوؤں پر پھیلاتیں تو ان کا مرجھایا ہوا چہرہ ایک عجیب ارمان بھری روشنی سے جگمگا اٹھتا۔ گہری صندوقوں جیسی شکنوں پر کٹوریوں کا عکس ننھی ننھی مشعلوں کی طرح جگمگانے لگتا۔ ہر ٹانکے پر زری کا کام ہلتا اور مشعلیں کپکپا اٹھتیں۔

یاد نہیں کب اس شبنمی دوپٹے کے بنے ٹکے تیار ہوئے اور گاڑھی کے بھاری قبر جیسے صندوق کی تہ میں ڈوب گئے۔ کٹوریوں کے جال دھندلا گئے گنگا جمنی کرنیں ماند پڑ گئیں۔ طول کے لچھے اداس ہو گئے۔ مگر کبریٰ کی برات نہ آئی جب ایک جوڑا پرانا ہو جاتا۔ تو اسے چالے کا جوڑا کہہ کر سینت دیا جاتا۔ اور پھر ایک نئے جوڑے کے ساتھ نئی امیدوں کا افتتاح ہو جاتا۔ بڑی چھان بین کے بعد

نئی دلہن چھانٹی جاتی۔ سہ دری کے چوکے پہ صاف ستھری جازم بچھی۔ محلہ کی عورتیں ہاتھ میں پاندان اور بغلوں میں بچے دبائے جھانجھیں بجاتی آن پہنچتیں۔

"چھوٹے کپڑے کی گوٹ تو اتر آئے گی! پر بچیوں کا کپڑا نہ نکلے گا۔"

"لو بُوا۔ لو اور سنو۔ تو کیا نگوڑی ماری ٹول کی چولیں پڑیں گی؟" اور پھر سب کے چہرے فکرمند ہو جاتے۔ کبریٰ کی ماں خاموش کیمیاگر کی طرح آنکھوں کے فیتے سے طول و عرض ناپتیں، اور بیویاں آپس میں چھوٹے کپڑے کے متعلق کھسر پھسر کر کے قہقہہ لگاتیں۔ ایسے میں کوئی من چلی کوئی سہاگ یا بنا چھیڑ دیتی! کوئی اور چار ہاتھ آگے والی سمدھنوں کو گالیاں سنانے لگتی، بیہودہ گندے مذاق اور چہلیں شروع ہو جاتیں۔ ایسے موقعوں پر کنواری بالیوں کو سہ دری سے دور سر ڈھانک کر کھپریل میں بیٹھنے کا حکم دیدیا جاتا۔ اور جب کوئی قہقہہ سہ دری سے ابھرتا تو بے چاریاں ایک ٹھنڈی، سانس بھر کر رہ جاتیں۔ اللہ! یہ قہقہے انہیں خود کب نصیب ہوں گے۔

اس چہل پہل سے دور کبریٰ شرم کی ماری مچھروں والی کوٹھری میں سر جھکائے بیٹھی رہتی۔ اتنے میں کتر بیونت نہایت نازک مرحلہ پر پہنچ جاتی۔ کوئی کلی الٹی کٹ جاتی۔ اور اس کے ساتھ بیویوں کی مت بھی کٹ جاتی۔ کبریٰ سہم کر دروازے کی آڑ سے جھانکتی۔

یہی تو مشکل تھی! کوئی جوڑا اللہ مارا چین سے نہ سلنے پایا۔ جو کلی الٹی کٹ جائے تو جان لو نائن کی لگائی ہوئی بات میں ضرور کوئی اڑنگا لگے گا یا تو

دور کی کوئی داشتہ نکل آئے گی۔ یا اس کی ماں ٹھوس کڑوں کا اڑنگا باندھے گی جو گوٹے میں کان آ جائے تو سمجھ لو یا مہر پر بات ٹوٹے گی۔ یا بھرت کے پایوں کے پلنگ پر جھگڑا ہو گا۔ چوتھی کے جوڑے کا شگون بڑا نازک ہوتا ہے۔ بی اماں کی ساری مشاقی اور سگھڑاپا دھرا رہ جاتا۔ نہ جانے عین وقت پر کیا ہو جاتا کہ دھنیا برابر بات طول پکڑ جاتی۔ بسم اللہ کے زور سے سگھڑ ماں نے جہیز جوڑنا شروع کر دیا تھا۔ ذرا سی کترن بھی بچی تو تیلے دانی یا شیشے کا غلاف سی کر دھنک گوکھرو سے سنوار کر رکھ دیتیں۔ لڑکی کا کیا ہے۔ کھیرے ککڑی کی طرح بڑھتی ہے۔ جو برات آ گئی تو یہی سلیقہ کام آئے گا۔

اور جب سے ابا گزرے سلیقہ کا بھی دم بھول گیا۔ حمیدہ کو ایک دم اپنے ابا یاد آ گئے۔ ابا کتنے دبلے پتلے لمبے جیسے محرم کا علم۔ ایک بار جھک جاتے تو سیدھے کھڑے ہونا دشوار تھا۔ صبح ہی صبح اٹھ کر نیم کی مسواک توڑ لیتے اور حمیدہ کو گھٹنے پر بٹھا کر نہ جانے کیا سوچا کرتے۔ پھر سوچتے سوچتے نیم کی مسواک کا کوئی پھونسڑا حلق میں چلا جاتا۔ اور وہ کھانستے ہی چلے جاتے۔ حمیدہ بگڑ کر ان کی گود سے اتر آتی۔ کھانسی کے دھکوں سے یوں ہل ہل جانا اسے قطعی پسند نہ تھا۔ اس کے ننھے سے غصے پر وہ ہنستے اور کھانسی سینہ میں بے طرح الجھتی۔ جیسے گردن کٹے کبوتر پھڑپھڑا رہے ہوں۔ پھر بی اماں آ کر انہیں سہارا دیتیں۔ پیٹھ پر دھپ دھپ ہاتھ مارتیں۔

"توبہ ہے ایسی بھی کیا ہنسی!"

اُچھو کے دباؤ سے سرخ آنکھیں اوپر اٹھا کر ابا بے کسی سے مسکراتے، کھانسی تو رک جاتی مگر وہ دیر تک بیٹھے ہانپا کرتے۔

"کچھ دوا دارو کیوں نہیں کرتے۔ کتنی بار کہا تم سے۔"

"بڑے شفاخانے کا ڈاکٹر کہتا ہے۔ سوئیاں لگواؤ۔ اور روز تین پاؤ دودھ اور آدھی چھٹانک مکھن۔"

"اے خاک پڑے ان ڈاکٹروں کی صورت پر۔ بھلا ایک تو کھانسی، اوپر سے چکنائی، بلغم نہ پیدا کر دے گی۔ حکیم کو دکھاؤ کسی۔"

"دکھاؤں گا۔" ابا حقہ گڑگڑاتے اور پھر اُچھو لگتا۔

"آگ لگے اس موئے حقے کو۔ اسی نے تو یہ کھانسی لگائی ہے۔ جوان بیٹی کی طرف بھی دیکھتے ہو آنکھ اٹھا کر۔"

اور اب ابا کبری کی جوانی کی طرف رحم طلب نگاہوں سے دیکھتے۔ کبری جوان تھی۔ کون کہتا تھا جوان تھی۔ وہ تو جیسے بسم اللہ کے دن سے ہی اپنی جوانی کی آمد کی سناؤنی سن کر ٹھٹک کر رہ گئی تھی۔ نہ جانے کیسی جوانی آئی تھی کہ نہ اس کی آنکھوں میں کرنیں ناچیں نہ اس کے رخساروں پر زلفیں پریشان ہوئیں۔ نہ اس کے سینے پر طوفان اٹھے اور نہ کبھی اس نے ساون بھادوں کی گھٹاؤں سے مچل مچل کر پریتم یا ساجن مانگے۔ وہ جھکی جھکی سہمی سہمی جوانی جو نہ جانے کب دبے پاؤں اس پر رینگ آئی۔ ویسے ہی چپ چاپ نہ جانے کدھر چل دی۔ میٹھا برس نمکین

ہوا اور پھر کرڑا ہو گیا۔

ابا ایک دن چوکھٹ پر اوندھے منہ گرے۔ اور انہیں اٹھانے کے لیے کسی حکیم یا ڈاکٹر کا نسخہ نہ آسکا۔

اور حمیدہ نے میٹھی روٹی کے لیے ضد کرنی چھوڑ دی۔

اور کبریٰ کے پیغام نہ جانے کدھر راستہ بھول گئے۔ جانو کسی کو معلوم ہی نہیں کہ اس ٹاٹ کے پردے کے پیچھے کسی کی جوانی آخری سسکیاں لے رہی ہے اور ایک نئی جوانی سانپ کے پھن کی طرح اٹھ رہی ہے۔

مگر بی اماں کا دستور نہ ٹوٹا۔ اور اسی طرح روز دوپہر کو سہ دری میں رنگ برنگے کپڑے پھیلا کر گڑیوں کا کھیل کھیلا کرتی ہیں۔

کہیں نہ کہیں سے جوڑ جمع کر کے شبرات کے مہینے میں کریپ کا دوپٹہ ساڑھے سات روپے میں خرید ہی ڈالا۔ بات ہی ایسی تھی۔ کہ بغیر خریدے گذارہ نہ تھا۔ منجھلے ماموں کا تار آیا کہ ان کا بڑا لڑکا راحت پولیس کی ٹریننگ کے سلسلہ میں آرہا ہے۔ بی اماں کو تو جیسے اک دم گھبراہٹ کا دورہ پڑ گیا۔ جانو چوکھٹ پر برات آن کھڑی ہوئی۔ اور انہوں نے ابھی دلہن کی مانگ کی۔ افشاں بھی نہیں کتری ہوں سے تو ان کے چھکے چھوٹ گئے۔ جھٹ اپنی منہ بولی بہن بندو کی ماں کو بلا بھیجا کہ:۔

"بہن میرا مری کا منہ نہ دیکھو جو اسی گھڑی نہ آؤ"

اور پھر دونوں میں کھُسر پھُسر ہوئی۔ بیچ میں ایک نظر دونوں کبریٰ پر بھی ڈال بیٹیں جو دالان میں بیٹھی چاول پھٹک رہی تھی۔ وہ اس کانا پھوسی کی زبان کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔

اس وقت بی اماں نے کانوں کی چار ماشہ کی لونگیں اتار کر منہ بولی بہن کے حوالے کیں۔ کہ جیسے تیسے کر کے شام تک تولہ بھر گوکرو، چھ ماشہ سلمہ ستارہ اور پاؤ گز نیفے کے لیئے ٹول لادیں۔ باہر کی طرف والا کمرہ جھاڑ پونچھ کر تیار کیا۔ تھوڑا سا چونا منگا کہ کبریٰ نے اپنے ہاتھوں سے کمرہ پوت ڈالا۔ کمرہ تو چٹا ہو گیا۔ مگر اس کی ہتھیلیوں کی کھال اڑ گئی۔ اور جب وہ رات کو مسالہ پیسنے بیٹھی تو چکر کھا کر دوہری ہو گئی۔ ساری رات کروٹیں بدلتے گذری۔ ایک تو ہتھیلیوں کی وجہ سے، دوسرے صبح کی گاڑی سے راحت آ رہے تھے۔

"اللہ! میرے اللہ میاں! اب کے تو میری آپا کا نصیبہ کھل جائے۔ میرے اللہ میں سو رکعت نفل تیری درگاہ میں پڑھوں گی" حمیدہ نے فجر کی نماز پڑھ کر دعا مانگی۔

صبح جب راحت بھائی آئے تو کبریٰ پہلے ہی سے مچھروں والی کوٹھڑی میں جا چھپی تھی۔ جب سیویوں اور پراٹھوں کا ناشتہ کر کے بیٹھک میں چلے گئے تو دھیرے دھیرے نئی دلہن کی طرح پیر رکھتی کبریٰ کوٹھڑی سے نکلی۔ اور جھوٹے برتن اٹھا لیئے۔

"لاؤ میں دھو دوں بی آپا!" حمیدہ نے شرارت سے کہا۔

"نہیں" وہ شرم سے جھک گئی۔

حمیدہ چھیڑتی رہی، بی اماں مسکراتی رہیں اور کریپ کے دوپٹے میں لپ ٹانکتی رہیں۔

جس راستہ کان کی لونگیں گئی تھیں۔ اسی راستے پھول۔ پتہ اور چاندی کی پازیب بھی چل دی۔ اور پھر ہاتھوں کی دو دو چوڑیاں بھی جو منجھلے ماموں نے رنڈاپا اتارنے پر دی تھیں۔ روکھی سوکھی خود کھا کر آئے دن راحت کے لیے پراٹھے تلے جاتے، کوفتے بھنا پلاؤ مہکتے۔ خود سوکھا نوالہ پانی سے اتار کر وہ ہونے والے داماد کو گوشت کے لچھے کھلاتیں۔

"زمانہ بڑا خراب ہے بیٹی"، وہ حمیدہ کو منہ پھلاتے دیکھ کر کہا کرتیں اور وہ سوچا کرتی۔ ہم بھوکے رہ کر داماد کو کھلا رہے ہیں۔ بی آپا صبح سویرے اٹھ کر جادو کی مشین کی طرح جٹ جاتی ہے۔ نہار منہ پانی کا گھونٹ پی کر راحت کے لیے پراٹھے تلتی ہے۔ دودھ اونٹاتی ہے۔ تاکہ موٹی سی بلائی پڑے۔ اس کا بس نہیں تھا۔ کہ وہ اپنی چربی نکال کر ان پراٹھوں میں بھر دے! اور کیوں نہ بھرے، آخر کو وہ ایک دن اس کا اپنا ہو جائے گا۔ جو کچھ کمائے گا۔ اس کی ہتھیلی پر رکھ دے گا۔ پھل دینے والے پودے کو کون نہیں سینچتا؟ پھر جب ایک دن پھول کھلیں گے اور پھلوں سے لدی ہوئی ڈالی جھکے گی۔ تو یہ طعنہ دینے والیوں کے منہ پر کیسا جوتا پڑے گا۔ اور اس خیال ہی سے میری بی آپا کے چہرے پر سہاگ کھل اٹھتا۔ کانوں

میں شہنایاں بجنے لگتیں۔ اور وہ راحت بھائی کے کمرے کو پلکوں سے جھاڑتیں اس کے کپڑوں کو پیار سے تہ کرتیں جیسے وہ کچھ ان سے کہتے ہوں! وہ ان کے بدبودار چوہوں جیسے سڑے ہوئے موزے دھوتیں، بساندی بنیان اور ناک سے لبڑے ہوئے رومال صاف کرتیں۔ اس کے تیل میں چپچپاتے ہوئے تکیئے کے غلاف پر سوئیٹ ڈریم کاڑھتیں، پر معاملہ چاروں کونے چوکس نہیں بیٹھ رہا تھا۔ راحت صبح انڈے پراٹھے ڈٹ کر جاتا۔ اور شام کو آکر کوفتے کھا کر سو جاتا۔ اور بی اماں کی منہ بولی بہن حکیمانہ انداز میں کھسر پھسر کرتیں۔

"بڑا شرمیلا ہے بیچارہ" بی اماں تاویلیں پیش کرتیں۔ "ہاں یہ تو ٹھیک ہے پر بھئی کچھ تو پتہ چلے رنگ ڈھنگ سے، کچھ آنکھوں سے۔"

"اے نوج، خدا نہ کرے میری لونڈیا آنکھیں لڑائے۔ اس کا آنچل بھی نہیں دیکھا ہے کسی نے"، بی اماں فخر سے کہتیں۔

"اے تو پردہ تڑوانے کو کون کہے ہے۔" بی آپا کے پکے مہاسوں کو دیکھ کر انہیں بی اماں کی دور اندیشی کی داد دینی پڑتی۔

"اے بہن تم تو سچ میں بہت بھولی ہو۔ یہ میں کب کہوں ہوں۔ یہ چھوٹی نگوڑی کون سی بقرعید کو کام آئے گی۔" وہ میری طرف دیکھ کر ہنستیں۔ "اری او نک چڑھی! بہنوئی سے کوئی بات چیت، کوئی ہنسی مذاق، اونہہ، اری چل دیوانی۔"

"اے تو میں کیا کروں خالہ؟"

"راحت میاں سے بات چیت کیوں نہیں کرتی؟"

"بھیا ہمیں تو شرم آتی ہے۔"

"اے ہے وہ تجھے پھاڑ ہی تو کھائے گا نا؟" بی اماں چڑھ کر بولیں۔

"نہیں تو مگر۔۔۔۔" میں لاجواب ہو گئی اور پھر مسکوٹ ہوئی، بڑی سوچ بچار کے بعد کھلی کے کباب بنائے گئے۔ آج بھی آپا بی کئی بار مسکرا پڑیں چپکے سے بولیں:-

"دیکھو ہنسنا نہیں، نہیں تو سارا کھیل بگڑ جائے گا۔"

"نہیں ہنسوں گی۔" میں نے وعدہ کیا۔

"کھانا کھا لیجیے۔" میں نے چوکی پر کھانے کی سینی رکھتے ہوئے کہا۔ پھر چوکی کے نیچے رکھے ہوئے لوٹے سے ہاتھ دھوتے وقت میری طرف سر سے پاؤں تک دیکھا تو میں بھاگی وہاں سے۔

میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اللہ توبہ کیا خناس آنکھیں ہیں۔

"جا نگوڑی ماری اری دیکھ تو سہی وہ کیسا منہ بناتا ہے! اے ہے سارا مزہ کرکرا ہو جائے گا۔"

آپا بی نے ایک بار میری طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں التجا تھی، لُٹی ہوئی براتوں کا غبار تھا۔ اور چوتھی کے پرانے جوڑوں کی مانند اداسی۔ میں سر جھکائے پھر کھمبے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

راحت خاموش کھاتے رہے۔ میری طرف نہ دیکھا۔ کھلی کے کباب کھاتے دیکھ کر مجھے چاہیئے تھا۔ کہ مذاق اڑاؤں، قہقہہ لگاؤں کہ:

"واہ جی واہ دولہا بھائی۔ کھل کے کباب کھا رہے ہیں" مگر جانو کسی نے میرا نرخرہ دبوچ لیا ہو۔

بی اماں نے چل کر مجھے واپس بلا لیا۔ اور منہ ہی منہ میں مجھے کوسنے لگیں اب میں ان سے کیا کہتی کہ وہ تو مزے سے کھا رہا ہے کمبخت۔

"راحت بھائی! کوفتے پسند آئے؟" بی اماں کے سکھانے پر میں نے پوچھا۔

جواب ندارد۔

"بتایئے نا؟"

"اری ٹھیک سے جا کر پوچھ" بی اماں نے ٹہوکا دیا۔

"آپ نے لا کر دیئے اور ہم نے کھائے۔ مزیدار ہی ہوں گے"

"ارے واہ رے جنگلی" بی اماں سے نہ رہا گیا۔

"تمہیں پتہ بھی نہ چلا کیا مزے سے کھلی کے کباب کھا گئے"

"کھلی کے؟" ارے تو روز کاہے کے ہوتے ہیں۔ میں تو عادی ہو چلا ہوں کھلی اور بھوسہ کھانے کا"

بی اماں کا منہ اتر گیا۔ بی آپا کی جھکیں ہوئی پلکیں اوپر نہ اٹھ سکیں۔ دوسرے روز

بی آپا نے روزانہ سے دگنی سلائی کی اور پھر جب شام کو میں کھانا لے کر گئی تو بولے

"کہئے آج کیا لائی ہیں؟" "آج تو لکڑی کے برادے کی باری ہے"

"کیا ہمارے ہاں کا کھانا آپ کو پسند نہیں آتا؟" میں نے جل کر کہا۔

"یہ بات نہیں، کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ کبھی کھلی کے کباب تو کبھی بھوسے کی ترکاری۔"

میرے تن بدن میں آگ لگ گئی ہم سوکھی روٹی کھا کے اسے ہاتھی کی خوراک دیں۔ گھی ٹپکتے پراٹھے ٹھسائیں۔ میری بی آپا کو جوشاندہ نصیب نہیں اور اسے دودھ ملائی نگلوائیں۔ میں بھنا کر چلی آئی۔

بی اماں کی منہ بولی بہن کا نسخہ کام آگیا اور راحت نے دن کا زیادہ حصہ گھر ہی میں گذارنا شروع کر دیا۔ بی آپا تو چولھے میں جھونکی رہتیں، بی اماں چوتھی کے جوڑے سیا کرتیں اور راحت کی غلیظ آنکھیں تیر بن کر میرے دل میں چبھا کرتیں، بات بے بات چھیڑنا، کھانا کھاتے وقت کبھی پانی تو کبھی نمک کے بہانے سے اور ساتھ ساتھ جملہ بازی۔ میں کھسیا کر بی آپا کے پاس جا بیٹھتی۔ جی چاہتا کسی دن صاف کہہ دوں کہ کس کی بکری اور کون ڈالے دانہ گھاس۔ اے بی مجھ سے تمہارا یہ بیل نہ ناتھا جائے گا۔ مگر بی آپا کے الجھے ہوئے بالوں پر چولھے کی اڑتی ہوئی راکھ۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔ میرا دل دھک سے ہو گیا، میں نے ان کے سفید بال لٹ کے نیچے چھپا دیئے۔ ناس جائے اس کمبخت نزلہ کا بچاری کے بال پکنے شروع ہو گئے۔

راحت نے پھر کسی بہانہ سے مجھے پکارا۔

"اونہہ" میں جل گئی۔ پر بی آپا نے کٹی ہوئی مرغی کی طرح جو پلٹ کر دیکھا تو مجھے جانا ہی پڑا۔

"آپ ہم سے خفا ہو گئیں؟" راحت نے پانی کا کٹورا لے کر میری کلائی پکڑ لی۔ میرا دم نکل گیا۔ اور بھاگی تو ہاتھ جھٹک کر۔

"کیا کہہ رہے تھے۔" بی آپا نے شرم و حیا سے گھٹی ہوئی آواز میں کہا میں چپ چاپ ان کا منہ تکنے لگی۔

"کہہ رہے تھے کس نے پکایا ہے کھانا۔ واہ واہ۔ جی چاہتا ہے کھاتا ہی جاؤں۔ پکانے والی کے ہاتھ کھا جاؤں۔۔۔۔۔ اوہ نہیں۔۔۔۔۔۔۔ کھا نہیں جاؤں بلکہ چوم لوں" میں نے جلدی جلدی کہنا شروع کیا اور بی آپا کا کھردار ہلدی دھنیا کی بساند میں سڑا ہوا ہاتھ اپنے ہاتھ سے لگا لیا۔ میرے آنسو نکل آئے" یہ ہاتھ" میں نے سوچا جو صبح سے شام تک مسالہ پیستے ہیں، پانی بھرتے ہیں، پیاز کاٹتے ہیں۔ بستر بچھاتے ہیں، جوتے صاف کرتے ہیں، یہ بے کس غلام صبح سے شام تک جٹے ہی رہتے ہیں۔ ان کی بیگار کب ختم ہو گی۔ کیا ان کا کوئی خریدار نہ آئے گا؟ کیا انہیں کبھی کوئی پیار سے نہ چومے گا؟ کیا ان میں کبھی مہندی نہ رچے گی؟ کیا ان میں کبھی سہاگ کا عطر نہ بسے گا۔؟ جی چاہا زور سے چیخ پڑوں۔

"اور کیا کہہ رہے تھے؟" بی آپا کے ہاتھ تو اتنے کھردرے تھے۔ پر آواز

اتنی رسیلی اور میٹھی تھی کہ اگر راحت کے کان ہوتے تو... مگر راحت کے نہ کان تھے نہ ناک بس دوزخ جیسا پیٹ تھا۔

اور کہہ رہے تھے "اپنی بی آپا سے کہنا کہ اتنا کام نہ کیا کریں۔ اور جوشاندہ پیا کریں۔

"چل جھوٹی"

"ارے واہ جھوٹے ہوں گے آپ کے وہ......"

"ارے چپ مردار" انہوں نے میرا منہ بند کر دیا۔

"دیکھ تو سوئٹر بن گیا ہے انہیں دے آ۔ پر دیکھ تجھے میری قسم میرا نام نہ لیجو۔"

"نہیں بی آپا۔ انہیں نہ دو وہ سوئٹر۔ تمہاری ان مٹھی بھر ہڈیوں کو سوئٹر کی کتنی ضرورت ہے؟" میں نے کہنا چاہا پر نہ کہہ سکی۔

"آپا بی، تم کیا پہنو گی؟"

"ارے مجھے کیا ضرورت ہے۔ چولھے کے پاس تو ویسے ہی جھلسن رہتی ہے۔"

سوئٹر دیکھ کر راحت نے اپنی ایک ابرو شرارت سے اوپر تان کر کہا:۔

"کیا یہ سوئٹر آپ نے بنا ہے؟"

"نہیں تو۔"

"تو بھئی ہم نہیں پہنیں گے۔"

میرا جی چاہا کہ اس کا منہ نوچ لوں کمینے۔ مٹی کے تھودے۔ یہ سوئٹر ان ہاتھوں

نے بنا ہے جو جیتے جاگتے غلام ہیں۔ اس کے ایک ایک پھندے میں کسی نصیبوں جلی کے ارمانوں کی گردنیں پھنسی ہوئی ہیں۔ یہ ان ہاتھوں کا بنا ہوا ہے۔ جو ننھے پنگوڑے جھلانے کے لیئے بنائے گئے ہیں۔ ان کو تھام لو گدھے کہیں کے اور یہ دو پتوار بڑے سے بڑے طوفان کے تھپیڑوں سے تمہاری زندگی کی ناؤ کو بچا کر پار لگا دیں گے۔ یہ ستار کی گت نہ بجا سکیں گے۔ منی پوری اور بھارت ناٹیم کے مدرا نہ دکھا سکیں گے۔ انہیں پیانو پر رقص کرنا نہیں سکھایا گیا۔ انہیں پھولوں سے کھیلنا نہیں نصیب ہوا۔ مگر یہ ہاتھ تمہارے جسم پر چربی چڑھانے کے لیئے صبح سے شام تک سلائی کرتے ہیں صابن اور سوڈے میں ڈبکیاں لگاتے ہیں۔ چولھے کی آنچ سہتے ہیں۔ تمہاری غلاظتیں دھوتے ہیں۔ تاکہ تم اجلے چٹے بگلا بھگتی کا ڈھونگ رچائے رہو۔ محنت نے ان میں زخم ڈال دیئے ہیں۔ ان میں کبھی چوڑیاں نہیں کھنکیں ہیں۔ انہیں کبھی کسی نے پیار سے نہیں تھاما۔

مگر میں چپ رہی۔ بی اماں کہتی ہیں میرا دماغ تو میری نئی نئی سہیلیوں نے خراب کر دیا ہے۔ وہ مجھے کیسی نئی نئی باتیں بتایا کرتی ہیں۔ کیسی ڈراؤنی موت کی باتیں بھوک اور کال کی باتیں۔ دھڑکتے ہوئے دل کے ایک دم چپ ہو جانے کی باتیں،

"یہ سوئٹر تو آپ ہی پہن لیجیئے دیکھیئے نا آپ کا کرتا کتنا باریک ہے۔"

جنگلی بلی کی طرح میں نے اس کا منہ، ناک، گریبان اور بال نوچ ڈالے اور اپنی پلنگڑی پہ جا گری۔ بی آپا نے آخری روٹی ڈال کر جلدی جلدی تسلے میں ہاتھ دھوئے اور آنچل سے پونچھتی میرے پاس آ بیٹھیں۔

"وہ بولے" ان سے نہ رہا گیا تو دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔

"بی آپا! یہ راحت بھائی بڑے خراب ہیں۔" میں نے سوچا۔ میں آج سب کچھ بتا دوں گی۔

"کیوں؟" وہ مسکرائیں۔

"مجھے اچھے نہیں لگتے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دیکھئے میری ساری چوڑیاں چورہ ہو گئیں۔" میں نے کانپتے ہوئے کہا۔

"بڑے شریر ہیں۔" انہوں نے رومانٹک آواز میں ٹھنک کر کہا۔

"بی آپا ۔ ۔ ۔ ۔ سنو بی آپا۔ یہ راحت اچھے آدمی نہیں۔" میں نے سلگ کر کہا۔

"آج میں بی اماں سے کہہ دوں گی۔

"کیا ہوا؟" بی اماں نے جا ء نماز بچھاتے ہوئے کہا۔

"دیکھو میری چوڑیاں بی اماں"

"راحت نے توڑ ڈالیں؟" بی اماں مسرت سے چہک کر بولیں۔

"ہاں"

"خوب کیا۔ تو اسے ستاتی بھی تو بہت ہے۔ اے ہے تو دم کاہے کو نکل گیا۔ بڑی موم کی بنی ہوئی ہو کہ ہاتھ لگایا اور پگھل گئیں۔" پھر چمکار کر بولیں "خیر تو بھی چوتھی میں بدلہ لے لیجئو وہ کسر نکالیو کہ یاد ہی کریں میاں جی۔" یہ کہہ کر انہوں نے نیت باندھ لی۔

منہ بولی بہن سے پھر کانفرنس ہوئی اور معاملات کو امید افزا راستے پہ گامزن

دیکھ کر ازحد خوشنودی سے مسکرایا گیا۔

"اے ہے تو تو بڑی ہی ٹھس ہے۔ اے ہم تو اپنے بہنوئیوں کا خدا قسم ناک میں دم کر دیا کرتے تھے۔"

اور وہ مجھے بہنوئیوں سے چھیڑ چھاڑ کے ہتھکنڈے بتانے لگیں کہ کس طرح انہوں نے صرف چھیڑ چھاڑ کے تیر بہدف نسخے سے ان دو ممبری بہنوں کی شادی کرائی جن کی ناؤ پار لگنے کے سارے موقعے ہاتھ سے نکل چکے تھے۔ ایک تو ان میں سے حکیم جی تھے جہاں بیچارے کو لڑکیاں بالیاں چھیڑتیں، شرماتے لگتے اور شرماتے شرماتے اختلاج کے دورے پڑتے لگتے۔ اور ایک دن ماموں صاحب سے کہہ دیا کہ مجھے غلامی میں لے لیجئے۔

دوسرے وائسرائے کے دفتر میں کلرک تھے۔ جہاں سنا کر باہر آئے ہیں لڑکیاں چھیڑنا شروع کر دیتیں۔ کبھی گلوریوں میں مرچیں بھر کے بھیجدیں۔ کبھی سوئیوں میں نمک ڈال کر کھلا دیا۔

اے لو وہ تو روز آنے لگے۔ آندھی آئے پانی آئے کیا مجال جو وہ نہ آئیں۔ آخر ایک دن کہلوا ہی دیا۔ اپنے ایک جان پہچان والے سے کہا کہ ان کے ہاں شادی کرا دو! پوچھا کہ "بھئی کس سے ؟" کہا "کسی سے بھی کرا دو" اور خدا جھوٹ نہ بلائے تو بڑی بہن کی صورت تھی کہ دیکھو تو جیسے بیجا چلا آتا ہے۔ چھوٹی تو بس سبحان اللہ۔ ایک آنکھ پورب تو دوسری پچھم۔ پندرہ تولے سونا دیا ہے باپ نے اور بڑے صاحب کے

دفتر میں نوکری الگ دلوائی۔"

ہاں بھئی جس کے پاس پندرہ تولے سونا ہو اور بڑے صاحب کے دفتر کی نوکری اسے لڑکا ملتے کیا دیر لگتی ہے؟ بی اماں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"یہ بات نہیں ہے بہن۔ آج کل کے لڑکوں کا دل بس تھالی کا بینگن ہوتا ہے جدھر جھکا دو بس ادھر ہی لڑھک جائے گا۔"

مگر راحت تو بینگن نہیں۔ اچھا خاصا پہاڑ ہے۔ جھکا دینے پر کہیں میں ہی نہ پس جاؤں۔ میں نے سوچا پھر میں نے آپا کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش دہلیز پر بیٹھی آٹا گوندھ رہی تھیں اور سب کچھ سنتی جا رہی تھیں۔ ان کا بس چلتا تو زمین کی چھاتی پھاڑ کر اپنے کنوار پنے کی لعنت سمیت اس میں سما جاتیں۔

کیا میری آپا مرد کی بھوکی ہے؟ نہیں وہ بھوک کے احساس سے پہلے ہی سہم چکی ہے۔ مرد کا تصور اس کے ذہن میں ایک امنگ بن کر نہیں ابھرا بلکہ روٹی کپڑے کا سوال بن کر ابھرا ہے۔ وہ ایک بیوہ کی چھاتی کا بوجھ ہے اس بوجھ کو دھکیلنا ہی ہو گا۔

مگر اشاروں کنایوں کے باوجود راحت میاں نہ تو خود منہ سے پھوٹے اور نہ ان کے گھر سے پیغام آیا۔ تھک ہار کر بی اماں نے پیروں کے توڑے گروی رکھ کر پیر مشکل کشا کی نیاز دلا ڈالی، دوپہر بھر محلہ ٹولے کی لڑکیاں صحن میں اودھم مچاتی رہیں۔ بی آپا شرماتی لجاتی مچھروں والی کوٹھری میں اپنے خون کی آخری بوندیں چسانے

کو جا بیٹھیں۔ بی اماں کمزوری میں اپنی چوکی پر بیٹھی چوتھی کے جوڑے میں آخری ٹانکے لگاتی رہیں۔ آج ان کے چہرے پر منزلوں کے نشان تھے۔ آج مشکل کشائی ہو گی۔ بس آنکھوں کی سوئیاں رہ گئی ہیں۔ وہ بھی نکل جائیں گی، آج ان کی جھریوں میں پھر مشعلیں تھرتھرا رہی تھیں۔ بی آپا کی سہیلیاں ان کو چھیڑ رہی تھیں، اور وہ خون کی بچی کھچی بوندوں کو تاؤ میں لا رہی تھیں۔ آج کئی روز سے ان کا بخار نہیں اترا تھا۔ تھکے ہارے دیئے کی طرح ان کا چہرہ ایک بار ٹمٹماتا اور پھر بجھ جاتا۔ اشارے سے انہوں نے مجھے اپنے پاس بلایا۔ اپنا آنچل ہٹا کر ملیدے کی طشتری مجھے تھما دی۔

اس پر مولوی صاحب نے دم کیا ہے۔" ان کی بخار سے دہکتی ہوئی گرم گرم سانس میرے کان میں لگی۔

طشتری لے کر میں سوچنے لگی۔ مولوی صاحب نے دم کیا ہے۔ یہ مقدس ملیدہ اب راحت کے تندور میں جھونکا جائے گا۔ وہ تندور جو چھ مہینے سے ہمارے خون کے چھینٹوں سے گرم رکھا گیا۔ یہ دم کیا ہوا ملیدہ مراد بر لائے گا۔ میرے کانوں میں شادیانے بجنے لگے۔ میں بھاگی بھاگی کوٹھے سے برات دیکھنے جا رہی ہوں۔ دولہا کے منہ پر لمبا سا سہرا پڑا ہے۔ جو گھوڑے کی ایالوں کو چوم رہا ہے ....

چوتھی کا شہابی جوڑا پہنے پھولوں سے لدی، شرم سے نڈھال، آہستہ آہستہ قدم تولتی ہوئی بی آپا چلی آ رہی ہیں ...... چوتھی کا زرتار جوڑا جھلمل کر رہا ہے۔ بی اماں کا چہرہ پھول کی طرح کھلا ہوا ہے ..... بی آپا کی حیا سے بوجھل نگاہیں،

ایک بار اوپر اٹھتی ہیں، شکریے کا ایک آنسو ڈھلک کر افشاں کے ذروں میں قمقمے کی طرح الجھ جاتا ہے۔

"یہ سب تیری محنت کا پھل ہے" بی آپا کی خاموشی کہہ رہی ہے...

حمیدہ کا گلا بھر آیا......

"جاؤ نہ میری بہنو" بی آپا نے اسے جگا دیا اور وہ چونک کر اوڑھنی کے آنچل سے آنسو پونچھتی ڈیوڑھی کی طرف بڑھی۔

یہ...... یہ ملیدہ"۔ اس نے اچھلتے ہوئے دل کو قابو میں رکھتے ہوئے کہا...... اس کے پیر لرز رہے تھے جیسے وہ سانپ کی بانبی میں گھس آئی ہو۔ اور پھر پہاڑ کھسکا..... اور منہ کھول دیا۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ مگر دور کہیں بارات کی شہنائیوں نے چیخ لگائی جیسے کوئی ان کا گلا گھونٹ رہا ہو، کانپتے ہاتھوں سے مقدس ملیدہ کا نوالہ بنا کر اس نے راحت کے منہ کی طرف بڑھا دیا۔

ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ پہاڑ کی کھوہ میں ڈوبتا چلا گیا..... نیچے تعفن اور تاریکی کے اتھاہ غار کی گہرائیوں میں، اور ایک بڑی سی چٹان نے اس کی چیخ کو گھونٹ دیا۔

نیاز کے ملیدے کی رکابی ہاتھ سے چھوٹ کر لالٹین کے اوپر گری اور لالٹین نے زمین پر گر کر دو چار سسکیاں بھریں اور گل ہو گئی۔ باہر آنگن میں محلہ کی بہو بیٹیاں مشکل کشا کی شان میں گیت گا رہی تھیں۔

صبح کی گاڑی سے راحت مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرتا ہوا روانہ ہوگیا۔ اس کی شادی کی تاریخ طے ہو چکی تھی اور اسے جلدی تھی۔

اس کے بعد اس گھر میں کبھی انڈے نہ تلے گئے، پراٹھے نہ سکے اور سوئٹر نہ بنے دق نے جو ایک عرصہ سے بی آپا کی تاک میں بھاگی پیچھے پیچھے آرہی تھی ایک ہی جست میں انہیں دبوچ بیٹھی۔ اور انہوں نے چپ چاپ اپنا مراد وجود اس کے آغوش میں سونپدیا۔

اور پھر اسی سہ دری میں چوکی پر صاف ستھری جازم بچھائی گئی۔ محلے کی بہو بیٹیاں جڑیں۔ کفن کا سفید سفید لٹھا موت کے آنچل کی طرح بی اماں کے سامنے پھیل گیا۔ تحمل کے بوجھ سے ان کا چہرہ لرز رہا تھا۔ بائیں ابرو پھڑک رہی تھی۔ گالوں کی سنسان جھریوں بھائیں بھائیں کر رہی تھیں جیسے ان میں لاکھوں اژدہے پھنکار رہے ہوں۔

لٹھے کی کان نکال کر انہوں نے چوپرتہ کیا۔ اور ان کے دل میں ان گنت قینچیاں چل گئیں آج ان کے چہرے پر بھیانک سکون اور ہرا بھرا اطمینان تھا جیسے انہیں پکا یقین ہو کہ دوسرے جوڑوں کی طرح چوتھی کا یہ جوڑا سنیا نہ جائے۔

ایک دم سہ دری میں بیٹھی لڑکیاں، بالیاں میناؤں کی طرح چہکنے لگیں۔ حمیدہ ماضی کو دور جھٹک کر ان کے ساتھ جا ملی۔ لال ٹولی پر۔ ۔ ۔ سفید گزی کا نشان! اس کی سرخی میں نہ جانے کتنی معصوم دلہنوں کا سہاگ رچا ہے۔ اور سفیدی میں کتنی نامراد کنواریوں

کے کفن کی سفیدی ڈوب کر ابھری ہے اور پھر سب ایک دم خاموش ہو گئے۔ بی اماں نے آخری ٹانکہ بھر کے ڈورا توڑ لیا۔ دو موٹے موٹے آنسو ان کے روئی جیسے نرم گالوں پر دھیرے دھیرے رینگنے لگے۔ ان کے چہرے کی شکنوں میں سے روشنی کی کرنیں پھوٹ نکلیں اور وہ مسکرا دیں۔ جیسے آج انہیں اطمینان ہو گیا کہ ان کی کبریٰ کا سوا جوڑا بن کر تیار ہو گیا ہو اور کوئی دم میں شہنائیاں بج اٹھیں گی۔